© rasailojaraid.com

امام امت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

علم الفقہ

مذاہب فقہ کا ارتقا اور ان میں اختلاف کے اسباب:

امام امت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جس کے شروع میں وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایسی میزان القا کی ہے جس سے میں ان تمام اختلافات کو جان لوں جو امت محمدیہ میں وقوع پذیر ہوئے اور جس سے میں یہ بھی جان لوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک حق کیا ہے؟ اللہ نے مجھے اس قابل بھی کیا کہ میں ان امور کو اس طرح بیان کروں کہ اس کے بعد کوئی شبہ اور اشکال نہ رہے۔ مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا کہ خاص طور پر فقہی احکام کے بارے میں صحابہ اور ان کے بعد کے لوگوں میں اختلاف کا سبب کیا تھا؟ یہ لکھنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان امور کے متعلق مجھ پر جو کچھ منکشف ہوا، اسے بیان کرنے کے لئے میں نے قلم اٹھایا ہے۔ یہاں اس رسالے کے مطالب کا اجمالی خلاصہ دیا جاتا ہے:

فقہی فروعات میں صحابہ اور تابعین کا اختلاف:

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانے میں فقہ مدون نہیں تھی اور نہ اس وقت احکام (فقہ) پر اس طرح بحث ہوتی تھی، جیسے یہ فقہا کرتے ہیں کہ ان احکام میں سے ہر چیز کے ارکان، شرائط اور آداب ہر ایک جدا جدا دلیل سے ثابت کرتے ہیں۔ مسائل کی صورتیں فرض کرتے ہیں۔ بیرونی فرضی صورتوں پر بحث کرتے ہیں۔ جو چیز تعریف میں حد کے قابل ہوتی ہے اس کی حد اور جو لائق حصر ہوتی ہے، اس کے حصر کا تعین کرتے ہیں۔ اور اس طرح کی اور بھی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ وضو فرماتے اور صحابہ آپ کو وضو کرتے دیکھتے۔ چنانچہ وہ اسے اختیار کر لیتے بغیر اس کے کہ آپ یہ بتاتے کہ یہ وضو کا رکن ہے، اور یہ وضو کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔ اس طرح آپ نماز پڑھتے اور صحابہ آپ کو نماز پڑھتے دیکھتے، چنانچہ وہ ویسے ہی نماز پڑھتے۔ جیسا آپ کو نماز پڑھتے دیکھتے۔ آپ نے حج کیا اور لوگوں نے آپ کو حج کرتے دیکھا۔ چنانچہ انہوں نے ویسے ہی حج کیا جیسا آپ نے کیا تھا۔

غرض آپ کا غالب طور پر یہی معمول تھا۔ آپ نے کبھی یہ بیان نہیں فرمایا کہ وضو کے فرض چھ ہیں یا چار، اور نہ کبھی یہ فرض کیا کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی اس طرح وضو کرے کہ وہ اعضا پر برابر پانی نہ ڈالے جس کی وجہ سے وضو صحیح یا غیر صحیح ہونیکا حکم لگایا جاسکے۔ اس بارے میں کبھی کبھی کچھ بیان فرمادیا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے متعلق صحابہ آپ سے بہت کم سوال کیا کرتے تھے۔

عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے وہ کہتے ہیں میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ انہوں نے آپ سے آپ کی رحلت تک صرف تیرہ سوال پوچھے، جن سب کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ ان میں ایک یہ تھا: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ (اے نبیؐ! یہ تم سے حرمت کے مہینوں میں لڑنے کے بابت پوچھتے ہیں) اور دوسرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوال تھا: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ (حیض کے احکام کے بارے میں)

ابن عباس کہتے ہیں کہ صحابہ آپ سے وہی بات پوچھتے تھے جو ان کے لئے فائدہ مند ہوتی۔

رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ جو واقعات رونما ہوتے، ان کے متعلق لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے اور آپ فتویٰ دیتے۔ اسی طرح آپ کے سامنے مقدمات پیش ہوتے اور آپ انہیں فیصلہ فرماتے۔ آپ لوگوں کو اچھا کام کرتے دیکھتے تو اس کی تعریف کرتے برا کام کرتے دیکھتے تو اسے ناپسند فرماتے۔ آپ فتویٰ پوچھنے والے کے لیے جو فتویٰ دیتے، کسی مقدمے کا جو فیصلہ کرتے یا کسی برے کام کرنے والے کے لئے برے کام پر اظہار ناپسندیدگی کرتے تو یہ سب کچھ اجتماعات میں ہوتا۔

ہر صحابی نے آپ کی عبادات، فتوؤں اور فیصلوں میں جو کچھ بھی اسے اللہ کی طرف سے میسر ہوا، وہ دیکھا۔ چنانچہ اس نے انہیں یاد رکھا، سمجھا اور ہر چیز کی حیثیت اس کے قرائن کے لحاظ سے جانی۔ اس نے ان علامات اور قرائن کی وجہ سے جو اس کے نزدیک کافی تھیں بعض کو اباحت پر، بعض کو مستحب ہونے پر اور بعض کو نسخ پر محمول کیا۔ اس میں ان کا اعتماد اپنے وجدان کے اطمینان و تسکین پر تھا اور استدلال کے طریقوں کی طرف اُن کا التفات نہ تھا۔

اختلاف کی ابتدا:

پھر صحابہ مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ اور ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی علاقے کا مقتدا اور پیشوا بن گیا۔ حالات بدلے تو واقعات بکثرت رونما ہوئے اور بہت سے مسائل پیدا ہوگئے، جن کی بابت صحابہ سے فتوے پوچھے جاتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک صحابی استفتا کا وہی جواب دیتا جو اُسنے رسول اللہ ﷺ کے فتوؤں اور فیصلوں میں سے یاد رکھا تھا یا اُن سے استنباط کیا تھا۔ اگر اپنے یاد رکھے ہوئے آپؐ کے فیصلوں اور فتوؤں اور اُن سے خود اپنے استنباط میں سے کوئی چیز ایسی نہ پاتا جو جواب کے قابل ہوتی تو اس صورت میں وہ صحابی اپنے اجتہاد رائے سے کام لیتا اور اُس علت کو معلوم کرتا جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد کردہ نصوص میں حکم کی بنیاد بنایا تھا۔ چنانچہ جہاں وہ اس علت کو پاتا، وہاں حکم جاری کرتا۔ اس میں صحابی کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ حکم رسول اللہ ﷺ کے مقصود و مرضی کے مطابق ہو۔ یہ تھی وہ صورت حال، جس میں صحابہ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے۔

یہ اختلافات کئی طرح کے تھے۔ ایک یہ کہ ایک صحابی نے کسی قضیے میں آپؐ کا کوئی فیصلہ یا فتویٰ سنا اور دوسرے نے اُسے نہیں سُنا۔ چنانچہ دوسرے نے اس طرح کے قضیے میں خود اجتہاد کیا اور اس کی بھی کئی صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اُس صحابی کا اجتہاد رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کے مطابق ہوتا۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو نسائی نے روایت کیا ہے اور وہ یہ کہ عبداللہ بن مسعود سے ایک عورت کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا، جس کا خاوند مرگیا تھا اور اس کا مہر مقرر نہیں ہوا تھا۔ عبداللہ بن مسعود نے لوگوں کے ایک ماہ کے اصرار کے بعد جو فتویٰ دیا، حُسنِ اتفاق سے بعد میں اُس کی تائید میں ایک حدیث بھی مل گئی۔ اس سے وہ اتنے خوش ہوئے کہ مسلمان ہونے کے بعد کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے تھے۔

دوسرے یہ کہ دو صحابیوں میں مناظرہ ہوتا اور اس ضمن میں ایسی حدیث مل جاتی، جس کی صحت کے بارے میں ظن غالب ہوتا۔ چنانچہ صحابی اپنے اجتہاد سے رجوع کرکے سنی ہوئی حدیث کو اختیار کرلیتا...... تیسرے یہ کہ صحابی کو ایک حدیث پہنچتی لیکن اس طرح کہ اس کی صحت کا ظن غالب نہ ہوتا۔ چنانچہ وہ صحابی اپنا اجتہاد ترک نہ کرتا اور حدیث کو مطعون قرار دیتا۔ حضرت عمرؓ نے فاطمہ بنت قیس کی مطلقہ عورت کے نفقہ اور سکنیٰ کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے منسوب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک روایت یہ کہہ کر مسترد کردی تھی کہ ہم ایک عورت کے قول سے کتاب اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے...... چوتھے یہ کہ ایک صحابی تک کوئی حدیث سرے سے پہنچی ہی نہ ہو......

احکامِ فقہ کے متعلق صحابہ میں جو اختلافات ہوئے، اُن میں سے ایک اس طرح کا اختلاف بھی تھا کہ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کو ایک عمل کرتے دیکھا، اُن میں سے بعض نے آپ ﷺ کے اس عمل کو عبادت پر محمول کیا اور بعض نے اسے مباح سمجھا...... اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک طواف میں رمل کرنا سنت ہے اور ابن عباس اس طرف گئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ عمل ایک وقتی ضرورت کے تحت اتفاق کے طور پر کیا تھا...... ایک اور اختلاف کسی واقعہ کی تعبیر میں وہم کی وجہ سے ہوا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حج کیا اور لوگوں نے آپ ﷺ کو حج کرتے دیکھا۔ بعض نے کہا کہ آپ متمتع تھے۔ بعض نے قارن کہا اور بعض نے مفرد......

صحابہ کے ان اختلافات میں سے ایک اختلاف کی وجہ سہو و نسیان تھی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ابن عمر نے روایت کی کہ آنحضرت ﷺ نے ایک عمرہ رجب میں کیا۔ جب حضرت عائشہ نے یہ سنا تو انہوں نے اس پر سہو کا حکم لگایا۔

ایک اختلاف حدیث کو اس کے اصلی معنوں میں ضبط نہ کرنے سے پیدا ہوا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ابن عمر نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میت کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے سُنا تو کہا کہ ابنِ عمر حدیث کو صحیح طرح سمجھ نہیں سکے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک یہودی کی قبر کے پاس سے گزرے اور اُس کے گھر والے اس کے لیے رو رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ اس پر رو رہے ہیں اور اُسے قبر میں عذاب ہورہا ہے۔ اس سے ابنِ عمر یہ سمجھے کہ میت کے عذاب کی علت اُس کے گھر والوں کا رونا تھا اور ہر میت پر انہوں نے یہ حکم عمومی طور پر لگادیا۔

صحابہ کے باہمی اختلافات کی وجہ کسی حکم کی علت کے بارے میں اُن کا آپس میں اختلاف تھا...... اور ایک اختلاف اس لیے ہوا کہ دو مختلف حکموں میں اُن کے درمیان موافقت نہ ہوسکی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جنگ خیبر کے سال رسول اللہ ﷺ نے متعہ کی اجازت دی پھر اس سے منع فرمایا۔ بعد میں جنگ اوطاس کے موقعے پر اس کی اجازت دی۔ پھر اس سے منع فرمایا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اجازتِ متعہ ضرورت کے لیے تھی اور جب ضرورت نہ رہی تو اس کی ممانعت کردی گئی۔ اور یہ حکم بدستور باقی ہے۔ یعنی ضرورت کے وقت متعہ جائز ہے اور جمہور کا کہنا یہ ہے کہ اجازت سے مقصود اُسے مباح کرنا تھا اور ممانعت سے اس کا مباح ہونا منسوخ ہوگیا۔

خلاصہ مختصر یہ ہے کہ احکامِ فقہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا اور اُن سے تابعین نے یہ سب اس طرح اخذ کیا کہ ان میں سے ہر ایک کو جو میسر آیا، اس نے جو کچھ بھی آپ ﷺ کی احادیث اور صحابہ کی مذاہب و مسالکِ فقہ کے ضمن میں سنا، اسے محفوظ کیا اور سمجھا اور حسب مقدرت اس سلسلے کی مختلف باتوں میں باہم مطابقت پیدا کی۔ بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی اور اُن کے نزدیک بعض اقوال اگرچہ وہ کبار صحابہ سے مروی تھے، کمزور قرار پائے، جیسے کہ جنبی کے تیمم کرنے کے متعلق حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ان کا مذہب ہے۔ کیونکہ اس بارے میں عمار، عمران بن حصین اور دوسرے لوگوں سے مروی حدیثیں مشہور ہوگئی تھیں۔

یہ صورت تھی جب علمائے تابعین میں سے ہر تابعی عالم کا فقہی مذہب اپنی اپنی جگہ جدا ہوگیا اور ہر شہر میں ایک امام بن گیا۔ مثلاً سعید بن مسیب اور سالم بن عبداللہ بن عمر اور دونوں کے بعد زہری اور قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن مدینہ میں امام ہوئے۔ عطا بن ابی رباح مکہ معظمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں، ابراہیم نخعی اور شعبی کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں طاؤس بن کیسان یمن میں اور مکحول شام میں۔

فقہ و مذاہب فقہ:

بعد ازاں اللہ نے بعض دلوں کو ان علمائے تابعین کے علوم کا پیاسا بنادیا وہ اِن کے علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے ان علماء سے حدیث، صحابہ کے فتوے، ان کے مذاہب فقہ اور خود اُن کی تحقیقات اخذ کیں۔ جن لوگوں کو فتوؤں کی ضرورت پڑتی تھی، وہ ان علمائے تابعین سے فتوے لیتے تھے۔ نیز بہت سے مسائل اُن کے درمیان زیر بحث آئے اور بہت سے معاملات اُن کے سامنے پیش کیے گئے۔ سعید بن مسیب، ابراہیم بن نخعی اور اُن جیسے دوسرے علماء نے فقہ کے تمام ابواب مدون کیے۔ ان میں سے ہر باب کے اُن کے پاس اصول تھے جو انہوں نے سلف سے حاصل کیے تھے۔

اس سلسلے میں سعید بن مسیب اور اُن کے اصحاب کا مذہب یہ تھا کہ اہلِ مکہ و مدینہ فقہ میں سب لوگوں سے زیادہ مستحکم مقام رکھتے ہیں۔ اور اُن کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کے فتاویٰ اور ان کے فیصلوں، نیز عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ اور ابن عباس کے فتاویٰ اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلوں پر ہے۔ سعید بن مسیب اور اُن کے اصحاب نے ان کی وہ سب باتیں جمع کیں، جن کی اللہ نے انھیں توفیق دی۔ پھر انہوں نے ان باتوں کی جانچ پڑتال کی۔ چنانچہ ان میں سے جن پر علمائے مدینہ کا اتفاق تھا، انہیں تو انہوں نے بڑی مضبوطی سے لے لیا اور جن کے بارے میں اُن کے ہاں اختلاف تھا، اُن میں سے جو سب سے قوی اور سب سے قابل ترجیح بات تھی، وہ انہوں نے لے لی۔ اب کسی بات کا قوی تر یا قابل ترجیح ہونا، یا تو اس لیے تھا کہ اُن میں سے اکثر اُس کے قائل تھے یا وہ بات قوی قیاس کے مطابق تھی، یا کتاب و سنت سے وہ واضح طور پر مستنبط تھی، یا اس طرح کی کوئی اور وجہ تھی۔ جب سعید بن مسیب اور اُن کے اصحاب اُن باتوں میں جو انہوں نے سلف سے اخذ کیں تھیں، اپنے روبرو پیش ہونے والے مسئلے کا جواب نہ پاتے تو وہ سلف کے کلام سے اُس کا جواب استنباط کرتے اور وہ اشارہ اور اقتضا کو ڈھونڈتے۔[1] اس طرح اُن کے ہاں فقہ کے ہر باب میں بہت سے مسائل جمع ہوگئے۔

جہاں تک ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب کا تعلق ہے، اُن کی رائے تھی کہ عبداللہ بن مسعود اور اُن کے اصحاب سب لوگوں سے بڑھ کر فقہ میں مستحکم مقام رکھتے ہیں۔ جیسا کہ علقمہ نے مسروق سے کہا تھا کہ کیا عبداللہ بن مسعودؓ سے بڑھ کر صحابہ میں کوئی فقیہ ہے اور امام ابو حنیفہ کا اوزاعی سے یہ کہنا کہ ابراہیم سالم بن عبداللہ بن عمر سے بڑے فقیہ ہیں۔ اور اگر ان کا رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہونے کا امتیاز نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ عبداللہ بن عمر سے علقمہ بڑے فقیہ ہیں اور عبداللہ بن مسعود تو عبداللہ بن مسعود ہیں ہی۔

ابراہیم نخعی کے مذہب فقہ کی بنیاد عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ، حضرت علیؓ کے فیصلے اور فتاویٰ، نیز شریح اور کوفہ کے دوسرے قاضیوں کے فیصلے ہیں۔ ابراہیم نخعی نے ان فتوؤں اور فیصلوں کو جہاں تک کہ اللہ نے اُنہیں توفیق دی، جمع کیا اور جیسے علمائے مدینہ نے کیا۔ چنانچہ اُن کے پاس فقہ کے ہر ہر باب کے الگ الگ مسئلے جمع ہوگئے۔

اب صورت یہ تھی کہ سعید بن مسیب فقہائے مدینہ کے ترجمان تھے اور حضرت عمرؓ کے فیصلے اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی احادیث اُن کو سب سے زیادہ یاد تھیں۔ اسی طرح ابراہیم نخعی فقہائے کوفہ کے ترجمان تھے۔ یہ دونوں جب کسی

---

[1] اگر کسی نص کے الفاظ اپنے ظاہری معنوں پر دلالت کریں تو وہ عبارۃ النص ہے۔ اگر ظاہری معنوں کے علاوہ دوسرے معنوں پر دلالت کریں تو وہ اشارۃ النص ہے اور اگر صحت الفاظ شرعاً یا عقلاً کسی معنی پر موقوف ہو تو وہ معنی اقتضاء نص ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منشے پر بات کرتے اور اُسے کسی کی طرف منسوب نہ کرتے تو اُن کی یہ بات اکثر اوقات سلف میں سے کسی کی طرف یا تو صریحاً یا اشارۃً یا اس سے ملتے جلتے کسی اسلوب سے منسوب ہوتی۔ ان دونوں یعنی سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی پر مدینہ اور کوفہ والوں کا اجتماع ہوا۔ انہوں نے اِن سے علم اخذ کیا۔ اُسے سمجھا اور اس سے نئے مسائل استنباط کیے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

مذہب فقہا میں اختلاف کے اسباب:

تابعین (جن کا ذکر اوپر ہوا) کے زمانے کے بعد اللہ نے حاملینِ علم کا ایک گروہ پیدا کیا تاکہ رسول اللہ ﷺ کا وہ وعدہ پورا ہو جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس علم کے، ہر بعد میں آنے والوں میں سے عادل لوگ حامل ہوں گے۔ چنانچہ اس گروہ نے تابعین میں سے جن سے وہ ملے، وضو، غسل، نماز، حج، نکاح، خرید و فروخت اور وہ اُمور جو بکثرت وقوع پذیر ہوتے ہیں، اُن کی کیفیت و صفت اخذ کی۔ نبی ﷺ کی احادیث روایت کیں، شہروں کے قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے سُنے۔ مسائل دریافت کیے اور اُن میں اجتہاد کیا۔ اس طرح وہ قوم کے بڑے بنے اور معاملات میں اُن کی طرف رجوع کیا گیا۔ یہ لوگ اپنے شیوخ و اساتذہ کے طریقے پر چلے اور انہوں نے اشارۃ النص اور اقتضاء النص سے کام لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ چنانچہ انہوں نے فیصلے کیے۔ فتوے دیے، احادیث نبویؐ روایت کیں اور تعلیم دی۔ اس طبقے کے ان علماء کا طریق کار ایک دوسرے کے مشابہ تھا۔ ان کے اس طریقہ کار کا خلاصہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو خواہ وہ مسند[1] ہو یا مرسل، قبول کیا جائے، اور صحابہ اور تابعین کے اقوال سے یہ جانتے ہوئے استدلال کیا جائے کہ یہ آپ ﷺ ہی کی نقل شدہ حدیثیں ہیں، جنھیں صحابہ نے مختصر کرلیا اور اسی طرح انہیں موقوف[1] بنالیا۔ اس کی مثال ابراہیم نخعی کا وہ قول ہے جس میں رسول اللہ ﷺ سے بیع محاقلہ[2] اور بیع مزابنہ کی ممانعت مروی ہے۔ اس پر اُن کو کہا گیا کہ کیا انھیں اس کے سوا رسول اللہ ﷺ کی کوئی اور حدیث یاد نہیں۔ انہوں نے جواب میں کہا: کیوں نہیں؟ لیکن (بغرضِ احتیاط) یہ کہنا مجھے زیادہ پسند ہے کہ عبداللہ اور علقمہ نے ایسا کہا ہے۔ اسی طرح شعبی نے، جب اُن سے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا گیا اور اُنھیں بتایا گیا کہ یہ حدیث مرفوع ہے۔ کہا کہ میں اس حدیث کی اسناد رسول اللہ ﷺ تک نہیں لے جاتا۔ (اسے مرفوع نہیں کرتا) مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں اس کی اسناد آپ ﷺ سے بعد کے کسی اعلیٰ شخص تک لے جاؤں کیونکہ اگر اس میں کوئی کمی بیشی ہوگی تو اس کی ذمہ داری آپ ﷺ سے بعد کے شخص پر ہوگی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تابعین کے بعد تبع تابعین میں سے حاملینِ علم کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ مسند اور مرسل ہر دو حدیثیں قبول کرتے تھے۔ نیز وہ صحابہ و تابعین کے اقوال سے استدلال کرتے تھے۔ ایک تو یہ جانتے ہوئے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ یہ اقوال رسول اللہ ﷺ سے منقول حدیثیں ہیں، جنہیں صحابہ نے مختصر کرلیا تھا اور دوسرے یہ جانتے ہوئے کہ صحابہ و تابعین کے یہ اقوال یا تو منصوص احکام سے خود اُن کے استنباطات ہیں، یا یہ اُن کے اجتہادِ آراء کا نتیجہ ہیں۔ ان کے

---

[1] مسند وہ حدیث ہے جس کی پوری سند بیان کی جائے اور اگر کوئی تابعی یا تبع تابعی بغیر سند کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد نقل کرتا ہے تو یہ حدیث مُرسل ہے۔

[1] مرفوع وہ حدیث ہے، جس میں صراحت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔ اور موقوف حدیث وہ ہے جس میں صحابہ ایک بات کہے اور یہ صراحت نہ کرے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔

[2] زمین کی پیداوار میں سے تہائی یا چوتھائی حصہ دینا محاقلہ ہے اور درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوروں کو خشک کھجوروں کے عوض بیچنا مزابنہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نزدیک صحابہ اور تابعین کا عمل اُن لوگوں سے جو اُن کے بعد آئے، زیادہ بہتر تھا، زیادہ صحیح تھا۔ زمانے کے اعتبار سے بھی اقدم تھا اور علم میں بھی بڑھ کر تھا، چنانچہ اس طرح صحابہ و تابعین کے اقوال کے اتباع کا تعین ہوگیا، سوائے اس کے کہ کسی معاملے میں خود اُن کے اقوال آپس میں مختلف ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث اُن کے کسی قول کی ظاہر طور پر مخالف ہو۔

غرض تبع تابعین کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب وہ دیکھتے کہ آپ ﷺ کی احادیث میں کسی مسئلے میں باہم اختلاف ہے تو وہ اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر صحابہ نے کسی حدیث کو منسوخ بتایا ہوتا یا انہوں نے اس کے ظاہری معنی نہ لیے ہوتے اور اُس کی تاویل کی ہوتی یا انہوں نے اس ضمن میں کوئی بھی تصریح نہ کی ہوتی، لیکن اُن کا اس حدیث کو ترک کرنے اور اس کے مطابق عمل نہ کرنے پر اتفاق ہوتا تو یہ گویا مصداق ہوتا حدیث میں کسی علت کی نشاندہی یا اُس کے منسوخ ہونے اور اُس کی تاویل کیے جانے کا۔ تبع تابعین نے اِن سب اُمور میں صحابہ کا اتباع کیا۔

اس کی مثال امام مالک کا وہ قول ہے جو برتن میں کتے کے منہ ڈالنے کی حدیث کے متعلق ہے، جس میں انہوں نے کہا کہ یہ حدیث تو ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ابنِ حاجب کا کہنا ہے کہ مالک کی اس سے مراد یہ ہے کہ میں نے فقہاء کو اس حدیث پر عمل کرتے نہیں دیکھا۔ اور جب کسی مسئلے میں صحابی اور تابعین کے مذاہب فقہ میں اختلاف ہوتا تو اس صورت میں تبع تابعین میں سے ہر عالم اپنے اہلِ شہر اور اپنے شیوخ و اساتذہ کا فقہی مذہب اختیار کرتا، کیونکہ وہ اُن کے اقوال میں سے صحیح اور غیر صحیح و سقیم کو بہتر جانتا۔ اُن اقوال سے متعلق جو اصول تھے، وہ اسے زیادہ یاد تھے، اور یہ کہ اُس کا دل اُن کی فضیلت اور اُن کی اجتہادی کوششوں کی طرف زیادہ مائل تھا۔

یہی وہ طبقۂ علما ہے، جن کے دلوں میں تدوین فقہ کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ مدینہ میں مالک اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذیب نے فقہ کی تدوین کی، مکہ میں ابن جریج اور ابن عُیینہ نے۔ ثوری نے کوفہ میں اور ربیع بن صبیح نے بصرہ میں۔ اور ان سب نے وہ منہج و طریقہ اختیار کیا جس کا میں ذکر کر آیا ہوں۔

اسی زمانے میں خلیفہ منصور نے حج کیا۔ اُس نے امام مالک سے کہا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ آپ نے جو کتاب مدوّن کی ہے، اس کے متعدد نسخے کراؤں اور مسلمانوں کے ہر علاقے میں اُس کا ایک نسخہ بھیجوں اور اُن کو حکم دوں کہ وہ اس کتاب پر عمل کریں، اور اسے چھوڑ کر دوسری بات کی طرف نہ جائیں۔ امام مالک نے کہا: اے امیر المؤمنین! ایسا نہ کیجئے۔ کیونکہ لوگوں کے پاس اس سے پہلے سلف کے اقوال پہنچ چکے ہیں۔ اُنہوں نے احادیثِ نبوی سنی ہیں اور روایتیں روایت کی ہیں۔ چنانچہ ہر قوم نے وہ بات لے لی جو اُس تک پہلے پہنچی اور لوگوں کے اختلاف کے باوجود اُس پر اُس نے عمل کیا۔ اے امیر المؤمنین! لوگوں کو اُن کے حال پر، اور ہر شہر نے اپنے لیے جو اختیار کیا ہے، اُس پر اسے چھوڑ دیجئے...... بعد ازاں مالک کے اصحاب نے اُن کی روایات اور اُن کے اختیار کردہ اقوال کو جمع کیا۔ اُن کی تلخیص کی، اُن کی شرح کی، اُن سے اور مسائل استنباط کیے اور اُن کے اصولوں اور دلائل پر بحث کی۔ اصحابِ مالک مغرب اور زمین کے دوسرے حصوں میں پھیل گئے اور اللہ نے اپنی بہت سی مخلوق کو ان سے فائدہ پہنچایا......

امام ابو حنیفہؒ، ابراہیم نخعی اور اُن کے ہمعصروں کے فقہی مذہب پر اوروں سے بڑھ کر جمے رہے اور وہ اس سے شاذ و نادر ہی تجاوز کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ، ابراہیم نخعی کے مذہب کی اساس پر مسائل کے استنباط کرنے میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ استنباط و تخریج کے امور میں اُن کی نظر بڑی گہری تھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اُن کی فروع پر بہت توجہ تھی۔ اگر تمہیں ہمارے اس قول کی حقیقت جاننا مقصود ہو تو امام محمد کی تصنیف کتاب الآثار عبدالرزاق کی جامع اور ابوبکر بن ابی شیبہ کی مصنف سے ابراہیم نخعی کے اقوال منتخب کرو۔ پھر امام ابو حنیفہؒ کے مذہب سے اُن کا مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ وہ بہت کم چیزوں میں ابراہیم کے راستے سے ہٹتے ہیں اور جہاں وہ بہت ہی کم چیزوں میں اس راستے سے ہٹتے ہیں تو وہ اِن میں فقہائے کوفہ کے مذہب سے باہر نہیں جاتے۔

امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب میں سب سے مشہور ابو یوسف تھے۔ وہ ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی القضاۃ بنے۔ اُن کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کا مذہب اور اُس پر عمل درآمد عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں پھیلا۔ اُن کے اصحاب میں تصنیف و تالیف میں سب سے بہتر اور درس و تدریس کو سب سے لازم پکڑنے والے محمد بن حسن تھے۔ اُن کے حالات یہ ہیں کہ انہوں نے فقہ امام ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ سے حاصل کی۔ پھر وہ مدینہ گئے اور امام مالکؒ سے انہوں نے موطا پڑھی۔ بعد ازاں انہوں نے خود غور و خوض کیا اور اپنے اصحاب کے مذہب کے ایک ایک مسئلے کا امام مالکؒ کی موطا سے مقابلہ کیا۔ اگر کسی مسئلے میں دونوں میں مطابقت ہوتی تو خیر، ورنہ اگر انہوں نے دیکھا کہ صحابہ اور تابعین میں کچھ لوگ اُن کے اصحاب کے مذاہب کی طرف گئے ہیں تو اس صورت میں وہ اس مسئلے کو ویسے ہی رہنے دیتے اور اگر انہوں نے اپنے اصحاب کے قیاس کو کمزور اور استنباط و تخریج کو نرم پایا اور اُسے ایسی صحیح حدیث کے خلاف پایا، جس پر کہ فقہاء نے عمل کیا یا اکثر علماء کا عمل اُن کے اصحاب کے مسئلے کے خلاف ہے تو وہ اسے ترک کر کے سلف کا وہ مذہب اختیار کرتے جو اُن کے نزدیک قابلِ ترجیح ہوتا۔

امام محمد نے کتابیں تصنیف کیں اور تینوں (امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور محمد) کی آرا جمع کیں۔ اس سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ بعد میں امام ابو حنیفہ کے اصحاب ان تصنیفات کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے ان کی تلخیص کی۔ اُن کے مطالب کو عام فہم بنایا۔ ان سے استنباطات کیے اور ان سے استدلال کیے۔ پھر یہ اصحاب خراسان اور ماوراء النہر میں پھیل گئے۔ اور یہاں تمام کا تمام مذہب ابوحنیفہؒ مشہور ہوا۔

امام شافعی کی اس زمانے میں نشوونما ہوئی، جن دنوں مذاہب (مالک اور حنفی) کے ظہور کا اوائل تھا اور اُن کے اصول و فروع مرتب ہو رہے تھے۔ امام شافعیؒ نے اپنے پہلوں کے کام کو دیکھا۔ اس میں انہوں نے بعض ایسی باتیں پائیں، جنہوں نے اُن کو پہلوں کی راہ پر چلنے سے روک دیا۔ ان باتوں کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب الاُمّ کے شروع میں کیا ہے۔ امام شافعی نے اپنے پہلوں کو دیکھا کہ وہ مرسل اور منقطع ہر دو قسم کی حدیثوں کو لیتے ہیں، جس کی وجہ سے اُن کے مذہب میں خلل واقع ہوتا ہے، کیونکہ جب حدیث کی تمام اسناد جمع کی جاتی ہیں تو اُن سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سی مرسل حدیثیں ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں اور بہت سی مسند حدیثیں ہیں، جو مرسل حدیثوں کے مخالف ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے یہ طے کیا کہ وہ کسی مرسل حدیث کو نہیں لیں گے جب تک کہ وہ اُن کے شرطوں پر پوری نہ اُترے اور یہ شرطیں اصول کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

نیز یہ کہ مختلف نصوص میں تطبیق دینے کے قواعد پہلوں کے ہاں منضبط نہ تھے۔ اس سے اُن کے اجتہادوں میں خلل در آتا تھا۔ امام شافعی نے تطبیق کے اصول وضع کیے اور انہیں اپنی کتاب میں مدون کیا۔ اصولِ فقہ میں یہ پہلی چیز تھی جو مدون ہوئی۔ بعض صحیح حدیثیں علمائے تابعین اور جن لوگوں سے فتوے لیے جاتے تھے، ان تک نہیں پہنچی تھیں، چنانچہ انہوں نے خود اجتہاد کیا۔ عمومی اصولوں کو اختیار کیا اور اپنے پیش رو صحابہ کرام کی اقتدا کی اور اسی کے مطابق فتوے دیے۔ بعد ازاں تیسرے طبقے میں وہ صحیح حدیثیں ظاہر ہوئیں تو بعد والوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اُن پر یہ گمان کر کے عمل نہ کیا کہ وہ اُن کے شہر والوں کے عمل اور اُن کی سنت کے جس میں کہ اُن کے نزدیک کوئی اختلاف نہ تھا، مخالف تھیں اور یہ بات اُن کے نزدیک حدیث میں موجبِ طعن اور علتِ سقوط ہے۔ یا وہ صحیح حدیثیں اس کے بعد ظاہر ہوئیں، جب محدثین نے طرق حدیث کو جمع کرنے کی طرف توجہ کی اور اس کے لیے وہ ملکوں ملکوں پھرے اور علم حدیث کے حاملین کو اُنہوں نے ڈھونڈا۔

امام شافعی نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ صحابہ اور تابعین میں سے علما کا برابر یہ معمول رہا کہ وہ ہر مسئلے کے حل کے لیے حدیث تلاش کرتے اور جب وہ اسے نہ پاتے تو استدلال کی کوئی دوسری نوع کو اختیار کرتے۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر اس بارے میں اُن کو حدیث مل جاتی تو اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر حدیث کی طرف رجوع کرتے۔ جب صورت حال یہ ہے تو صحابہ یا تابعین کا کسی مسئلے میں حدیث سے تمسک نہ کرنا، اُس حدیث کے حق میں موجبِ طعن نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ وہ خود اس کے موجب طعن ہونے کی علت کی نشاندہی کردیں... اور یہ کہ امام شافعی کے زمانے میں صحابہ کرام کے اقوال جمع ہونے اور وہ کثیر التعداد تھے، اُن میں باہم اختلاف تھا۔ امام شافعی نے دیکھا کہ ان اقوال میں سے بہت سے اس لیے صحیح حدیث کے خلاف ہیں کہ اُن صحابہ تک صحیح حدیث نہیں پہنچی تھی اور انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ سلف ایسے معاملے میں برابر حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس صورت میں امام شافعی نے صحابہ کرام کے ان اقوال سے تمسک کرنا ترک کردیا، جن میں کہ وہ متفق نہ تھے اور کہا: "ھم رجال ونحن رجال."

اور یہ کہ امام شافعیؒ نے دیکھا کہ فقہا میں سے بعض لوگ ہیں کہ وہ رائے کو جسے شریعت نے جائز نہیں کیا، قیاس سے جس کا شریعت نے اثبات کیا ہے' خلط ملط کرتے ہیں۔ یعنی ایک کو دوسرے سے متمیز نہیں کرتے، کبھی وہ اس رائے کو استحسان کا نام دیتے ہیں اور رائے سے میری مراد یہ ہے کہ کسی حرج یا مصلحت کے موقع کو حکم کی علت ٹھہرایا جائے۔ قیاس یہ ہے کہ حکم منصوص سے علت نکالی جائے اور اسی علت پر حکم کا مدار ہو۔ الغرض امام شافعی نے رائے کی اس نوع کو پوری طرح باطل قرار دیا اور کہا کہ جو کوئی استحسان کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ خود شارع بنے۔

حاصل مطلب یہ کہ امام شافعی نے جب اس طرح کے اُمور میں پہلوں کا یہ رویہ دیکھا تو انہوں نے فقہ پر نئے سرے سے بحث کی۔ چنانچہ انہوں نے اس کے اصول بنائے، ان اصولوں سے فروع کا استنباط کیا اور کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بڑا اچھا کام کیا اور لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ اُن کے پاس فقہاء کا اجتماع ہوا۔ انہوں نے امام شافعی کی کتابوں کا اختصار کیا، اُن کی شرح کی اور اُن سے استدلال اور تخریج و استنباط میں مدد لی۔ بعد ازاں یہ فقہا شہروں میں پھیل گئے۔

اہل حدیث اور اصحاب رائے میں اختلاف کے اسباب:

سعید بن مسیب، ابراہیم نخعی اور زہری کے زمانے میں نیز امام مالکؒ اور سفیان اور اُن کے بعد کے زمانے میں ایسے علما تھے جو شرعی مسائل میں رائے میں انہماک کرنا مکروہ سمجھتے تھے اور ضرورت کے بغیر جس سے کہ انہیں چارہ نہ تھا، فتویٰ دینے اور استنباطِ مسائل سے خائف رہتے تھے۔ اُن کو سب سے زیادہ اہتمام اس امر کا ہوتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث روایت کریں۔ عبداللہ بن مسعود سے کسی چیز کے متعلق پوچھا گیا، انہوں نے کہا کہ مجھے یہ ناپسند ہے کہ میں تیرے لئے کسی ایسی چیز کو حلال کروں جو اللہ نے تیرے لئے حرام کی ہے یا ایسی چیز کو حرام کروں جو اللہ نے تیرے لیے حلال کی ہے۔

معاذ بن جبل نے کہا: اے لوگو! بلا کے نازل ہونے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے پہلے جلدی مت کرو (یعنی جب تک کوئی مسئلہ درپیش نہ ہو، اُس کے بارے میں نہ پوچھو) کیونکہ مسلمانوں میں ایسے لوگ ہمیشہ رہیں گے کہ اُن سے جب کسی مسئلے کے متعلق پوچھا جائے گا تو وہ درست جواب دیں گے۔ اسی طرح حضرت عمر، حضرت علی، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود سے جو واقعہ کہ ابھی رونما نہیں ہوا، اس کے بارے میں فتویٰ پوچھنے کی کراہت مروی ہے...... ابو نضر کہتے ہیں کہ جب ابو سلمہ بصرہ پہنچے تو میں اور حسن (بصری) ان کے پاس گئے۔ انہوں نے حسن سے کہا کہ کیا تم ہی حسن ہو۔ مجھے بصرہ میں تم سے بڑھ کر کسی اور سے ملنا منظور خاطر نہ تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو۔ پس اپنی رائے سے کبھی فتویٰ نہ دو۔ فتویٰ دو تو صرف سنتِ رسول اللہ ﷺ اور نازل شدہ قرآنِ مجید سے۔

(ان حالات نے احادیث کو جمع کرنے کی ضرورت پیدا کی۔ چنانچہ) بلادِ اسلام میں احادیثِ نبوی ﷺ اور آثار صحابہ کی تدوین اور اس ضمن میں رسالوں اور کتابوں کو لکھنے کا اس قدر رواج ہوا کہ اہل روایت میں سے کم ہی کوئی ایسا ہوگا جس کے پاس احادیث و آثار کا مدوّن شدہ کوئی رسالہ یا کتاب نہ ہو۔ اس سے اُن کی ضرورتیں بڑی اچھی طرح پوری ہوئیں۔ اہلِ روایت کے علمائے عظام میں سے جنہوں نے بھی یہ زمانہ پایا، وہ حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کے علاقوں میں گھومے پھرے۔ ان بزرگوں نے کتابیں جمع کیں۔ اُن کے مختلف نسخوں کو تلاش کیا اور غریب[1] حدیثوں اور نادر آثار میں غور و خوض کیا۔ غرض ان کے اہتمام سے احادیث و آثار کا اتنا ذخیرہ جمع ہوگیا کہ اُن سے پہلے کسی کے پاس جمع نہیں ہوا تھا۔ اور اُن کو وہ چیز میسر آئی جو اُن سے پہلے کسی کو میسر نہیں آئی تھی۔

(اس دور سے پہلے) سفیان ثوری، وکیع اور اُن کی طرح کے دوسرے بزرگ اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود مرفوع متصل احادیث میں سے ایک ہزار بھی جمع نہ کرپائے تھے، جیسا کہ امام ابوداؤد بحستانی نے اہلِ مکہ کے نام اپنے خط میں لکھا۔ لیکن اس طبقے والے چالیس ہزار کے قریب احادیث کی روایت کرتے ہیں۔ بلکہ امام بخاری سے صحیح طور پر منقول ہے کہ اُنہوں نے صحیح بخاری کا چھ لاکھ حدیثوں سے اختصار کیا۔ امام ابوداؤد بحستانی سے منقول ہے کہ اُنہوں نے اپنی سنن کا پانچ لاکھ حدیثوں سے اختصار کیا۔ اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند کو ایک ایسی کسوٹی بنایا، جس سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث پرکھی جاسکتی ہے۔ پس جو حدیث اُن کی مسند میں ہے، خواہ وہ ایک ہی سند سے مروی ہو تو اُن کی لازماً کوئی نہ کوئی اصل ہے اور اگر وہ حدیث اُن کی مسند میں نہیں تو اس کی کوئی اصل نہیں۔ ان کے سرتاج لوگ یہ تھے عبدالرحمٰن بن مہدی، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، ابوبکر بن شیبہ، مسدد، ہناد، احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، فضل بن دکین، علی بن مدینی اور ان جیسے دوسرے بزرگ۔ محدثین کے طبقات میں یہ طبقہ درجہ اوّل پر تھا۔

ان میں سے جو محقق تھے، وہ فنِ روایت کو مستحکم کرنے اور احادیث کے درجات کو جاننے کے بعد فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ اس رائے کے حامی نہ تھے کہ فقہ کے کسی صاحبِ مذہب کی تقلید پر جو پہلے گزر چکا ہے، اتفاق کریں۔ کیونکہ وہ ان فقہی مذاہب میں سے ہر مذہب میں احادیث و آثار کے مخالف چیزیں دیکھ رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور صحابہ، تابعین و مجتہدین کے اثار کی، اُن قواعد کے مطابق جنہیں انہوں نے اپنے دلوں میں مستحکم کرلیا تھا، تحقیق و تفحص شروع کردی۔ میں اُن قواعد کو یہاں مختصراً بیان کرتا ہوں:

اُن کے ہاں یہ قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی مسئلے میں

[1] وہ حدیث جس کا راوی ایک ہو، خواہ وہ کسی درجے میں ہو، اُسے غریب کہتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کے حکم کو ناطق و واضح پاتے تو پھر وہ اُس سے دوسری چیز کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ اور جب قرآن میں کئی صورتوں کا احتمال ہوتا تو اُس پر سنت کا حکم فیصلہ کن ہوتا۔ چنانچہ جب وہ کسی مسئلے کا حکم قرآن میں نہ پاتے تو وہ سنتِ رسول اللہ ﷺ کو اختیار کرتے۔ خواہ وہ فقہاء کے اندر مشہور اور رائج ہوتی، خواہ وہ کسی شہر یا کسی خاندان یا کسی خاص طریق سے مختص ہوتی۔ خواہ صحابہ اور فقہاء نے اس پر عمل کیا ہوتا یا نہ کیا ہوتا۔ غرض جب کسی مسئلے کے متعلق حدیث ہوتی تو اس کے خلاف نہ تو آثار صحابہ و تابعین میں سے کسی اثر کا اور نہ مجتہدین میں سے کسی مجتہد کے اجتہاد کا اتباع کیا جاتا۔

جب وہ کسی مسئلے کے متعلق احادیث کی تلاش میں پوری کوشش کر لیتے اور ان کو کوئی حدیث نہ ملتی تو وہ صحابہ و تابعین کی جماعت کے اقوال اختیار کرتے۔ اس میں وہ کسی خاص گروہ یا کسی خاص شرع کے پابند نہ تھے، جیسے کہ اُن کے پیش روؤں کا معمول تھا۔ چنانچہ اگر خلفا اور فقہا کسی چیز پر متفق ہوتے تو اس کا اتباع کیا جاتا اور اگر اُن میں اختلاف ہوتا تو وہ اُن میں سے ایسے شخص کی حدیث اختیار کرتے جو علم، تقویٰ اور حدیثوں کو ٹھیک ٹھیک یاد رکھنے میں دوسروں سے بڑھ کر ہوتا۔ یا وہ بات اختیار کرتے جو اُن سے زیادہ مشہور ہوتی...... یہ جو قواعد ہیں وہ پہلوں کے عمل اور صریح اقوال سے مستنبط کیے گئے تھے۔

بالجملہ جب (علمائے حدیث) نے فقہ کو ان قواعد پر مرتب کیا تو ان مسائل میں سے جن پر ان کے پیش رو گفتگو کر گئے تھے۔ نیز وہ اُمور جو خود اِن کے زمانے میں وقوع پذیر ہوئے، ان سب میں سے کوئی مسئلہ اور امر ایسا نہ تھا، جس کے بارے میں اُن کو حدیث مرفوع متصل یا مرسل یا موقوف صحیح یا حسن یا کوئی قابلِ اعتبار حدیث نہ ملی ہو۔ یا انہوں نے شیخین (حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) یا باقی خلفاء، شہروں کے قاضیوں اور فقہائے بلاد کے آثار میں سے کوئی اثر نہ پایا ہو۔ یا خود انہوں نے (نصوص کتاب و سنت) کے عموم اشارہ اور اقتضا سے استنباط نہ کیا ہو۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے اس طرح سنت پر عمل کرنا آسان کر دیا۔ ان میں سے بڑے مرتبے والے، سب سے بڑھ کر روایات کرنے والے، سب سے زیادہ حدیث کے درجات کو جاننے والے اور فقہ میں سب سے زیادہ گہرائی رکھنے والے امام احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راہویہ تھے اور فقہ کا اس طریقے پر مرتب کرنا منحصر تھا احادیث و آثار کے ایک بہت بڑے ذخیرے کے جمع کرنے پر۔

اِن (علمائے حدیث) کے مقابلے میں امام مالک، امام سفیان ثوری اور اُن کے بعد والوں کے زمانے میں ایسے لوگ بھی تھے جو تخریج مسائل کو مکروہ نہ سمجھتے تھے اور نہ وہ فتویٰ دینے سے خوف کھاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دین کی بنیاد فقہ پر ہے۔ اس لیے فقہ کی نشر و اشاعت ہونی چاہیے۔ وہ نبی ﷺ کی حدیث کو روایت کرنے اور اُسے آپ ﷺ کی طرف مرفوع کرنے سے ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ شعبی کا قول ہے کہ کسی حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے بعد والوں پر ہی موقوف کرنا ہمیں زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ اگر حدیث میں زیادتی یا کمی ہو تو وہ انہی پر ہوگی جو آپ ﷺ سے بعد کے تھے۔

افراط و تفریط:

معلوم ہونا چاہیے کہ فقہا کے کلام سے کسی مسئلے کی تخریج اور اس مقصد کے لیے حدیث کے الفاظ کا تتبع اور اُن میں غور و خوض، ان ہر دو کی دین میں ایک مستحکم بنیاد ہے اور ہر زمانے میں علمائے محققین ان دونوں طریقوں کو ہمیشہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ اُن میں سے بعض ایک طریق کو کم اور دوسرے کو زیادہ اور بعض ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم اختیار کرتے تھے، لیکن یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ان دو طریقوں میں سے کسی ایک کو بالکل چھوڑ دیا جائے، جیسا کہ دونوں فریقوں کے عوام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں۔ یقیناً خالص حق یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں میں سے ایک کو دوسرے کے مطابق کیا جائے اور ایک میں جو کمی ہو وہ دوسرے سے پوری کی جائے۔ اس ضمن میں حسن بصری کا یہ جو قول ہے، اُس سے یہی مراد ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''اس اللہ کی قسم، جس کے سوا کوئی معبود نہیں،
تمہاری سنت ان دو کے یعنی غلو کرنے والے اور
حد سے بڑھنے والے کے بین بین ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ جو اہل حدیث میں سے ہو، اُسے چاہیے کہ جس چیز کو اُن نے اختیار کیا ہے، یا جس کو اُس نے اپنا مذہب و مسلک بنایا ہے وہ اسے تابعین اور اُن سے بعد آنے والوں میں جو مجتہدین تھے، اُن کی آرا پر پیش کرے۔ اسی طرح جو اہل التخریج میں سے ہو، اسے چاہیے کہ وہ سنن و احادیث کے معاملے میں اپنے اندر اتنی صلاحیت پیدا کرے کہ وہ اس کی وجہ سے صریح طور پر صحیح حدیث کی مخالفت سے محفوظ رہے۔ اور جس امر میں کہ حدیث یا اثر موجود ہے، اُس کے بارے میں حتی الوسع اپنی رائے استعمال نہ کرے۔

(اہل الحدیث اور اہل التخریج کا افراط و تفریط کے بارے میں) جو بات ہم کہہ رہے ہیں، اس کی تائید اس رائے سے ہوتی ہے جو امام ابو سلیمان خطابی نے اپنی کتاب ''معالم السنن'' میں ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے اس زمانے میں اہلِ علم کو دیکھا ہے کہ اُن کے دو گروہ ہوگئے ہیں اور وہ دو فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک اصحاب حدیث و اثر کا فرقہ ہے اور دوسرا اہلِ فقہ ونظر کا۔ اُن میں سے کوئی بھی دوسرے سے اپنی احتیاج میں الگ نہیں اور نہ وہ اپنے مقصد و غرض وغیرہ کو حاصل کرنے میں دوسرے سے بے نیاز ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ حدیث کی حیثیت ایک اساس کی ہے جو کہ اصل ہے اور فقہ کا درجہ عمارت کا ہے جو کہ اس اصل کی ایک فرع و شاخ ہے۔ ہر وہ عمارت جو ایک مستقل اساس پر قائم نہیں، وہ منہدم ہوجاتی ہے اور ہر وہ اساس جس پر کوئی عمارت نہیں، وہ اُجاڑ و بیابان ہے۔''

''میں نے ان دونوں فرقوں کو دیکھا ہے کہ باوجود اس کے کہ دونوں کے محلِ وقوع پاس پاس ہیں، دونوں کی منزلوں میں قربت ہے۔ اُن میں سے ایک کو دوسرے کی عام ضرورت ہے اور دونوں لازمی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ پھر بھی وہ ایسے بھائی ہیں کہ راہِ حق میں نہ وہ ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہیں اور نہ اُن میں باہم تعاون ہے۔ حالانکہ ایسا کرنا اُن کے لیے لازمی ہے، جہاں تک اس طبقے کا تعلق ہے، جو اہل حدیث و اثر ہے، اُن میں سے اکثر کی تگ و دو یہ ہے کہ وہ روایات نقل کریں۔ اسنادِ احادیث جمع کریں، غریب اور شاذ حدیثیں، جن میں اکثر موضوع یا مقلوب[1] ہیں، تلاش کریں۔ یہ لوگ نہ تو احادیث کے متن کا لحاظ کرتے ہیں، نہ اُن کے معانی سمجھتے ہیں۔ نہ اُن میں جو راز ہوتا ہے، اس کا استنباط کرتے ہیں اور نہ اُن کے اصل جوہر اور اُن میں جو فقہی نکتہ ہوتا ہے، اُس کا استخراج کرتے ہیں۔ بسا اوقات اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ فقہاء پر عیب لگاتے ہیں۔ انہیں مطعون کرتے ہیں، اُن پر سنن و احادیث کی مخالفت کا الزام دھرتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ فقہا کو جو علم دیا گیا ہے، اس کے درجے سے وہ بہت پیچھے ہیں اور فقہاء کے بارے میں بُری بات کہہ کر وہ مرتکب گناہ ہوئے ہیں۔''

''باقی رہا دوسرا طبقہ اور وہ ہے اہلِ فقہ ونظر کا۔ اُن میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ وہ حدیث کی طرف کم ہی میل رکھتے ہیں۔ وہ صحیح حدیث کو ضعیف سے تمیز نہیں کرپاتے اور نہ وہ کھری کو کھوٹی سے پہچان سکتے ہیں۔ اگر اُن کو کوئی ایسی حدیث مل جائے جو اگرچہ اُن کے اختیار کردہ مذاہب اور اُن کی اپنائی ہوئی آرا کے موافق ہو، پھر بھی وہ اس سے اپنے

[1] وہ حدیث جس کے الفاظ میں راوی نے غلطی سے تقدیم و تاخیر کردی ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخالف کے خلاف دلیل قائم کرنے کی طرف دھیان نہیں کرتے۔ انہوں نے آپس میں طے کر رکھا ہے کہ ضعیف خبر اور منقطع حدیث اس وقت ہی قبول کی جائے گی اگر وہ اُن کے شیوخ میں مشہور ہو اور زبانوں پر اس کا چرچا ہو۔ خواہ اس میں نہ پختگی ہو نہ یقینی علم۔ اُن کا ایسا طے کرنا رائے کی لغزش اور بے چارگی ہے۔''

تقلید و عدم تقلید:

معلوم ہونا چاہیے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگ فقہ کے ایک معین مذہب کی تقلید پر متفق نہ تھے، ابو طالب مکی اپنی کتاب ''قوت القلوب'' میں لکھتے ہیں:

''یہ کتابیں اور رسائل کے مجموعے بعد کی چیزیں ہیں۔ لوگوں کے اقوال بیان کرنا، ایک خاص شخص کے فقہی مذہب پر فتوئ دینا، ہر چیز میں اُن کے قول اور روایت کو اختیار کرنا اور اس کے مذہب پر اعتماد کرنا، پہلے اور دوسرے قرن میں عہد قدیم میں لوگوں کا یہ معمول نہ تھا۔''

بلکہ اس دور میں لوگوں کے دو طبقے تھے۔ ایک علماء کا طبقہ اور دوسرا عوام کا۔ عوام کا حال یہ تھا کہ وہ متفقہ علیہ مسائل میں، جن کے بارے میں مسلمانوں کے اندر یا جمہور مجتہدین میں کوئی اختلاف نہ تھا، وہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کسی اور کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ وہ وضو اور غسل کی کیفیت اور نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام اپنے باپ دادوں یا اپنے شہر کے معلمین سے سیکھتے اور اسی پر چلتے تھے۔ جب اُن کو کوئی نادر و غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو جس مفتی کو پاتے، بغیر کسی فقہی مذہب کے تعین کے، اُس سے فتویٰ پوچھتے۔ ابنِ ہمام نے اپنے رسالے ''التحریر'' میں لکھا ہے کہ یہ لوگ ایک بار کسی ایک مفتی سے فتویٰ لیتے اور دوسری بار کسی دوسرے سے فتویٰ لے لیتے اور اس میں کسی ایک مفتی کا التزام نہ کرتے۔

جہاں تک علماء کا تعلق ہے، اُن کے دو درجے تھے۔

ایک وہ عالم جنہوں نے قرآن، سنت اور آثار کے تتبع و جستجو میں اتنی محنت و کوشش کی کہ اُن کو بالقوۃ جسے بالفعل ہی سمجھئے، ایسا ملکہ حاصل ہوگیا کہ وہ لوگوں میں مفتی بن سکتے تھے۔ یعنی لوگوں کو جو واقعات پیش آتے تھے، اُن میں سے اکثر کے بارے میں وہ فتوے دے سکتے تھے اور وہ اُمور جن کے متعلق وہ جواب دیتے، زیادہ ہوتے تھے، اُن امور سے جن کی نسبت وہ توقف کرتے۔ یہ لوگ مجتہد مطلق کے نام سے مختص تھے۔

دوسرے وہ عالم تھے جن کو قرآن و سنن کی اتنی معرفت حاصل تھی جس سے وہ فقہ کے اصول اور اس کے بنیادی مسائل کو اُن کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جان سکتے تھے۔ بعض (جزوی) ایسے مسائل تھے، جن میں انہیں دلائل کے ذریعہ ایک واضح اور غالب رائے حاصل ہوجاتی تھی اور بعض کے متعلق وہ توقف کرتے۔ ان آخر الذکر مسائل کے بارے میں وہ علماء سے مشورہ کرنے کے محتاج ہوتے، کیونکہ ان کے متعلق کسی واضح اور غالب رائے تک پہنچنے کے لیے اُن کے پاس پوری طرح وہ وسائل نہیں تھے جو مجتہد مطلق کے پاس تھے۔ چنانچہ یہ علماء بعض مسائل میں مجتہد تھے اور بعض میں غیر مجتہد۔

صحابہ اور تابعین سے یہ چیز تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب اُن کو کوئی حدیث پہنچتی تو وہ کسی شرط کا خیال کیے بغیر اس پر عمل کرتے، لیکن دو صدیوں بعد لوگوں میں معین مجتہدین کے مذاہب کو اختیار کرنے کا رجحان ظہور پذیر ہوا۔ چنانچہ ان میں بہت کم ایسے تھے جو کسی خاص معین مجتہد کے مذہب کے پابند نہ ہوتے۔ یہ اس زمانے میں ایک امر واجب ہوگیا۔

(ابتدائی دو صدیوں میں کسی معین فقہی مذہب کو اختیار کرنے کا دستور نہ تھا۔ تیسری صدی میں کسی نہ کسی معین فقہی مذہب کو اختیار کرنا عام ہوگیا اور اس زمانے میں یہ چیز ایک امر واجب قرار پائی) اگر تم مجھ سے کہو کہ ایک زمانے میں ایک چیز غیر واجب ہے تو دوسرے زمانے میں کس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واجب ہوسکتی ہے؟ جبکہ شریعت تو ایک ہی ہے۔ چنانچہ تمہارا یہ قول کہ مجتہدِ مستقل کی اقتدا پہلے واجب نہ تھی، پھر واجب ہوگئی، تناقض کا حامل ہے۔ اس کے جواب میں میرا کہنا یہ ہے کہ واجب اصلی تو یہ ہے کہ امّت میں ایک شخص ہو جو فروعی احکام کی اُن کے تفصیلی دلائل کے ساتھ معرفت رکھتا ہو۔ اس پر سب اہلِ حق کا اتفاق ہے۔ (قاعدہ یہ ہے کہ) جس بات پر واجب موقوف ہوتا ہے، وہ بات بھی واجب ہوتی ہے۔ جب واجب کے متعدد طریقے ہوں تو اُن میں سے کسی نہ کسی طریقے کا تعین کیے بغیر حاصل کرنا واجب ہوتا ہے اور جب اس کا ایک ہی طریق ہو تو خاص اس طریق کا حاصل کرنا واجب ہوتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جب آدمی سخت بھوک میں مبتلا ہو اور اُس کی وجہ سے اُسے ہلاک ہونے کا ڈر ہو اور بھوک کو دُور کرنے کے چند طریقے ہوں جیسے کھانا خریدنا، جنگل سے پھل توڑ لینا اور ایسی چیز کا شکار کرنا جو غذا کا کام دے۔ اس صورت میں بھوک کو دُور کرنے کے ان متعدد طریقوں میں سے کسی بھی غیر معین طریقے پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ لیکن اگر وہ آدمی ایسی جگہ بھوک میں مبتلا ہوتا ہے جہاں نہ شکار ہے نہ پھل تو اس صورت میں اُس پر واجب ہے کہ وہ مال خرچ کرے اور کھانا خریدے۔

(جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ واجب اصلی تو یہ ہے کہ امّت میں ایک شخص ہو جو فروعی احکام کی اُن کے تفصیلی دلائل کے ساتھ معرفت رکھتا ہو) سلف کے اس واجب اصلی کو حاصل کرنے کے متعدد طریقے تھے اور اس بارے میں کسی ایک طریقے کا تعین اُن کے لیے واجب نہ تھا۔ پھر سوائے ایک طریقے کے باقی سب طریقے بند ہوگئے۔ چنانچہ یہ مخصوص طریقہ اُن پر واجب ہوگیا۔

(ایک دوسری مثال یہ ہے) سلف احادیث لکھا نہیں کرتے تھے۔ آج احادیث کا لکھنا واجب ہے کیونکہ آج ان کتب احادیث کی معرفت کے بغیر حدیثوں کی روایت کی اور کوئی صورت نہیں۔ اسی طرح سلف کا علم نحو اور لغت میں اشتغال نہ تھا۔ اس لیے کہ ان کی زبان عربی تھی اور انہیں ان فنون کی حاجت نہ تھی، لیکن آج ہمارے اس زمانے میں عربی لغت کی معرفت واجب ہوگئی ہے کیونکہ اولین عربوں کے زمانے کو گزرے عرصہ دراز ہوگیا ہے۔

الغرض ہم جو یہ بات کہہ رہے ہیں، اس کی تائید میں بہت سے شواہد ہیں۔ اسی پر ایک معین امام کی تقلید کے واجب ہونے کو قیاس کرنا چاہئے اور ایک معین امام کی تقلید کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی واجب نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر جب ایک جاہل شخص ہند اور ماوراء النہر کے شہروں میں ہو اور وہاں کوئی شافعی، مالکی اور حنبلی عالم نہیں اور نہ ان مذاہب فقہ کی وہاں کوئی کتاب موجود ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ کے فقہی مذہب کی تقلید کرے اور اس سے باہر جانا اس کے لیے حرام ہوگا، کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے آپ کو دائرۂ شریعت ہی سے باہر نکال دے گا اور بے کار اور مہمل بن کر رہ جائے گا۔

اس کے برخلاف اگر وہ حرمین میں ہو تو چونکہ وہاں اُسے تمام مذاہب فقہ کی معرفت میسّر ہوگی، اس کے لیے یہ کافی نہیں کہ وہ کسی غیر ثقہ ظنی بات پر عمل کرے۔ نہ وہ عوام کی زبان سے نکلی ہوئی کوئی بات قبول کرے اور نہ کسی غیر مشہور کتاب سے کوئی قول لے۔ یہ سب باتیں کنز الدقائق کی شرح نہر الفائق میں مذکور ہیں۔

اگر تم یہ کہو کہ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ پہلوں نے اصولِ فقہ پر بہت زیادہ گفتگو نہیں کی اور جب امام شافعی پیدا ہوئے تو انہوں ہی نے اس موضوع پر کافی و شافی بحث کی، مفید بحثیں کیں اور بڑی اچھی بحث کی؟ میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ پہلوں میں سے ہر ایک کے پاس اپنے ہی شہر کی احادیث جمع تھیں اور اُن کے علاوہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے شہروں کی احادیث اُن کے پاس جمع نہیں تھی۔ جب اس کے خاص شہر کی احادیث کی دلیلوں میں اُس کے سامنے کوئی تعارض واقع ہوتا تو وہ اپنی سمجھ اور فراست کے مطابق اُس تعارض کا فیصلہ کرتے۔ جب امام شافعی کا زمانہ آیا تو تمام شہروں کی احادیث یکجا جمع ہوگئیں اور اِس کی وجہ سے ان مختلف شہروں کی احادیث اور اُن کے فقہاء کے اختیار کردہ اقوال میں دو طرح کا تعارض پیدا ہوگیا۔ ایک تو تعارض تھا دو مختلف شہروں کی احادیث میں اور دوسرا تعارض تھا ایک ہی شہر کی احادیث کے درمیان اور وہ یوں کہ ہر شخص اپنے شیخ کی رائے کی جو اس نے اپنی سمجھ اور فراست سے قائم کی ہوتی، حمایت کرتا۔ اس سے رخنہ بہت وسیع ہوگیا۔ بہت سے گروہ وجود میں آگئے اور ہر طرف سے اختلاف نے لوگوں پر اس طرح یلغار کردی کہ اس کا کسی کو سان گمان نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ حیران و پریشان ہوکر رہ گئے اور انہوں نے اپنے سامنے کوئی راہ نہ پائی۔

(یہ حالات تھے) جب لوگوں کو اُن کے رب کی طرف سے مدد پہنچی۔ چنانچہ امام شافعی کو باہم اختلاف رکھنے والی حدیثوں میں تطبیق کرنے کے قواعد القا کیے گئے اور انہوں نے اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے ایک دروازہ کھولا اور وہ کیا ہی اچھا دروازہ تھا۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد کے دَور

چوتھی صدی ہجری کے بعد لوگوں میں جو کچھ ہوا، اُس کا بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں: پھر ان قرنوں کے بعد دوسرے لوگ آئے جو کبھی دائیں طرف گئے اور کبھی بائیں اور اُن میں بہت سے امور ظہور پذیر ہوئے۔

ان میں سے ایک یہ کہ علمِ فقہ میں جدل و اختلاف نے راہ پائی اور اس کی تفصیل امام غزالی نے یوں بیان کی ہے:

''جب ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کا عہد ختم ہوگیا تو خلافت ایسے لوگوں کو ملی جو بغیر استحقاق کے اس کے مالک ہوئے۔ وہ علمِ فتویٰ واحکام کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ وہ فقہا سے مدد لینے اور اپنے تمام احوال میں اُن کو ساتھ رکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس وقت تک ایسے علماء موجود تھے جو قدیم طرز پر برابر ثابت قدم اور دین خالص پر قائم تھے۔ جب انہیں (خلفاء کی طرف سے) بلایا جاتا تو وہ دُور بھاگتے اور ان سے اعراض کرتے۔ اُن زمانوں کے لوگوں نے علماء کی یہ عزت دیکھی اور باوجود حکام سے اُن کے اعراض کے، حکام کے اُن کی طرف متوجہ ہونے کو ملاحظہ کیا۔ یہ دیکھ کر لوگ حصولِ عزت اور طلبِ جاہ کی خاطر علم حاصل کرنے کی طرف جھک پڑے۔ چنانچہ پہلے جہاں فقہا مطلوب تھے، اب وہ خود طالب بن گئے۔ پہلے جہاں وہ سلاطین سے اعراض کرنے کی وجہ سے معزز تھے، اب وہ ان کے دروازوں پر جانے کی وجہ سے ذلیل ہوگئے۔ بے شک اُن میں کچھ مستثنیات بھی تھے جن کو توفیقِ الٰہی شاملِ حال تھی۔

ان سے پہلے بعض لوگوں نے علمِ کلام میں کتابیں تصنیف کی تھیں اور اس سلسلے میں بہت کچھ قیل و قال، اعتراضات اور اُن کے جوابات اور بحث و جدل کے قواعد جمع کردیئے تھے۔ اس سے رؤسا اور بادشاہوں کے ہاں ان کو بڑا مقام ملا۔ اس کے بعد ان رؤسا اور بادشاہوں میں سے بعض ایسے ہوئے جن کے نفوس کا رجحان فقہ کے مناظروں اور یہ کہ فقہ کے شافعی اور حنفی مذاہب میں سے اولیٰ اور برتر کون ہے؟ ان کی طرف ہوا۔ پس لوگوں نے علمِ کلام اور دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فنونِ علم چھوڑے۔ خاص طور سے وہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے درمیان جو اختلافی مسائل تھے، اُن کی طرف جھک پڑے اور امام مالک، امام سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل اور دوسروں کے اختلاف کے بارے میں تساہل برتا۔ (کیونکہ خلفاء اور سلاطین کے ہاں ان پر مناظرے نہیں ہوتے تھے)''

ان اُمور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ لوگ تقلید پر مطمئن ہوگئے اور تقلید اُن کے سینوں میں (چپکے چپکے) اس طرح گھس گئی جیسے چیونٹی گھس جاتی ہے اور اس کا انہیں شعور تک نہ ہوا۔ اس کا سبب تھا فقہاء کی آپس میں چپقلش اور اُن میں باہم بحث وجدل۔ بات یہ ہے کہ جب ان میں فتویٰ دینے پر آپس میں چپقلش ہونے لگی تو صورت یہ ہوتی کہ جب بھی کوئی شخص ایک چیز کے بارے میں فتویٰ دیتا تو اس کے فتویٰ پر اعتراض ہوتا اور اسے ردّ کیا جاتا اور یہ بحث اُس وقت تک ختم نہ ہوتی جب تک کہ اس مسئلے کے متعلق متقدمین میں سے کسی کا واضح حوالہ نہ دیا جاتا۔

اسی سلسلے میں ایک امر قاضیوں کا ظلم و زیادتی کرنا بھی تھا۔ ہوا یہ کہ اکثر و بیشتر قاضی ظلم و زیادتی کرنے لگے اور وہ اپنے کام میں امین نہ تھے تو اُن کے وہی فیصلے مانے جاتے تھے، جن میں عوام کو شک و شبہ نہ ہوتا اور اُس سے پہلے اس طرح کا فیصلہ کیا گیا ہوتا۔

اور ایک بات یہ بھی تھی کہ اُس زمانے میں رؤسا یعنی حکمران جاہل تھے اور لوگ اُن سے فتوے لیتے تھے جو نہ علمِ حدیث سے بہرہ رکھتے تھے اور نہ تخریج مسائل کے طریقے سے، جیسا کہ تم اکثر متاخرین کا حال ظاہر طور پر جانتے ہو۔ اس بارے میں ابن ہمام اور دوسروں نے تنبیہ بھی کی ہے۔

اُسی زمانے میں غیر مجتہد کو فقیہ کہنے لگے اور یہی وہ زمانہ تھا جب وہ تعصب میں راسخ ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ فقہاء کے درمیان اختلاف کی اکثر صورتوں میں، خاص طور سے ان مسائل میں جن میں صحابہ کے اقوال دونوں طرف ہیں، سوال صرف دو قولوں میں سے ایک قول کو ترجیح دینے کا ہے...... سلف اس سلسلے میں مسئلہ زیر بحث کے اصلاً شرعی ہونے میں اختلاف نہیں کرتے تھے۔ اُن میں اگر اختلاف ہوتا تھا تو اس امر میں کہ دونوں قولوں میں سے اولیٰ اور برتر کونسا ہے؟...... اور وہ اس قسم کی بہت سی باتوں کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ اس بارے میں صحابہ میں اختلاف تھا اور وہ سب کے سب راہِ ہدایت پر تھے۔ اسی بنا پر علمائے متقدمین اجتہادی مسائل میں مفتیوں کے فتوے برابر جائز ٹھہراتے رہے، قاضیوں کے فیصلے تسلیم کرتے رہے اور بعض اوقات وہ اپنے فقہی مذاہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے۔ چنانچہ تم ان اُمور میں ائمہِ مذاہب کو صرف ہر قول کی تصحیح کرتے ہی دیکھو گے۔ وہ اِن اُمور میں موجود اختلاف کا اثبات اس طرح کرتے ہیں کہ اُن میں کوئی ایک کہتا ہے کہ یہ قول زیادہ محتاط ہے، یہ مختار اور مرجح ہے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے اور کوئی کہتا ہے کہ اس بارے میں ہم تک اس کے سوا کچھ نہیں پہنچا۔ اس طرح کی باتیں المبسوط، آثار امام محمد اور کلام امام شافعی میں بکثرت ہیں۔

اس کے بعد جو لوگ آئے، انہوں نے اپنے پہلے لوگوں کے کلام کا اختصار کیا۔ جو اختلافات تھے، انہیں تقویت دی اور وہ اپنے ائمہ کے اختیار کردہ (مختار) قول پر جم گئے اور یہ اس لیے کہ سلف سے اپنے اصحاب کے فقہی مذہب کا پابند رہنے اور اس سے کسی حال میں بھی باہر نہ نکلنے کی تاکید مروی تھی۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر انسان اپنے اصحاب اور اپنی قوم کی مختار چیزوں کو پسند کرتا ہے۔

(اب صورت یہ ہے کہ) صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے بعض لوگ تھے جو (نماز میں قرأت سے پہلے) بسم اللہ پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے تھے، بعض جہراً یعنی زور سے پڑھتے اور بعض جہراً نہیں پڑھتے تھے، بعض فجر کی نماز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں دعائے قنوت پڑھتے اور بعض نہیں پڑھتے تھے، بعض پچھنے لگوانے، نکسیر پھوٹنے اور قے کرنے کے بعد نئے سرے سے وضو کرنا ضروری سمجھتے تھے اور بعض ضروری نہیں سمجھتے تھے......

ان باتوں کے باوجود امام ابوحنیفہ، اُن کے اصحاب اور امام شافعی اور دوسرے، مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے۔ اگرچہ آخر الذکر نماز میں بسم اللہ جہراً پڑھتے تھے نہ سرّاً۔ خلیفہ ہارون الرشید نے پچھنے لگوا کر نماز کی امامت کی، امام ابویوسف نے اُس کے پیچھے نماز پڑھی اور اُسے دہرایا نہیں۔ گو ہارون الرشید نے امام مالک کے اس فتوے پر عمل کیا تھا کہ پچھنے لگوانے کے بعد نیا وضو لازمی نہیں۔

امام احمد بن حنبل کے نزدیک نکسیر پھوٹنے اور پچھنے لگوانے کے بعد نیا وضو کرنا چاہیے۔ اُن سے کسی نے پوچھا کہ اگر امام کے بدن سے خون نکلے اور وہ نیا وضو نہ کرے تو آپ اُس کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ امام ابن حنبل نے جواب دیا کہ میں امام مالک اور سعید بن مسیّب کے پیچھے کیسے نماز نہیں پڑھوں گا؟

ایک اور بات یہ ہوئی کہ بہت سے لوگ ہر فن میں باریک بینی کرنے لگے...... اور ہر ایک نے اپنے اصحاب کے لیے جدلیات کے قواعد استنباط کر ڈالے۔ انہوں نے طرح طرح کے اعتراضات وارد کیے اور پھر اُن کے بڑھ بڑھ کے جواب دیئے...... بعض نے مسائل کی ایسی ایسی بعید صورتوں کو فرض کرنا شروع کردیا کہ وہ اس قابل نہ تھیں کہ کوئی عقلمند اُن کے درپے ہوتا...... اس بحث و جدل اور اختلاف و باریک بینی کا فتنہ اُس فتنۂ اوّل کی طرح تھا جب لوگ مُلک و سلطنت کے لیے ایک دوسرے سے لڑے اور ہر شخص نے اپنے آدمی کی حمایت کی۔ جس طرح اس لڑائی جھگڑے کے نتیجے میں ظالم و مستبد بادشاہ برسرِ اقتدار آئے اور دوسرے اندوہناک واقعات ہوئے اسی طرح اس بحث و جدل نے ایسی جہالت اور اس طرح کے خلط ملط شکوک و اوہام کو جنم دیا، جن کی کوئی حد نہ تھی۔ چنانچہ ان لوگوں کے بعد ایسی نسلیں آئیں جن کی نشوونما خالص تقلید پر ہوئی۔ وہ حق کو باطل سے اور بے کار جدل کو استنباطِ مسائل سے تمیز نہیں کرسکتے تھے۔ اس وقت فقیہ وہی تھا جو بہت بولتا اور جو اس کے منہ میں آتا وہ کہہ دیتا۔ جسے فقہاء کے قوی اور ضعیف اقوال بلا اُن میں تفریق کیے یاد ہوتے اور وہ اُنھیں باچھیں کھول کھول کر بیان کرتا۔

اور محدّث وہ تھا جو صحیح اور غیر صحیح و سقیم احادیث کو شمار کرتا اور اپنے جبڑوں کے زور سے اُنھیں کہانیوں کی طرح فرفر سناتا جاتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ایک کُلّی و عمومی بات ہے، کیونکہ اللہ کے بندوں میں سے ایسا گروہ بھی ہے کہ اُس کے مخالف اُسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ یہی لوگ اگرچہ وہ کم ہیں، اللہ کی زمین میں اُس کی حجت ہیں۔

اس زمانے کے بعد جو بھی نسل آئی وہ اور بھی زیادہ فتنے اور تقلید میں بڑھی ہوئی تھی اور اس کے افراد کے سینے امانت سے محروم ہونے میں پہلوں سے بڑھ کر تھے۔ چنانچہ اُن کی حالت یہ تھی کہ وہ دین میں غور و خوض نہ کرنے کے معاملے میں بالکل مطمئن ہوگئے اور اُن کا قول یہ تھا:-

اَنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاَنَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ

ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا اور ہم اُن ہی کے قدموں کے نشانوں کی پیروی کرتے ہیں۔

اس کی شکایت اللہ ہی سے ہے، اُسی سے مدد مطلوب ہے اور اسی پر بھروسہ اور توکل ہے۔

اجتہاد و تقلید

علماء کے کلام سے، اجتہاد کی جو حقیقت سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت کے فروعی احکام کو اُن کی تفصیلی دلیلوں سے دریافت کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کرنا۔ اِن تفصیلی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دلیلوں کے اُمورِ کلّی کا مرجع یہ چار چیزیں ہیں: قرآن مجید، سنتِ نبویؐ، اجماعؒ، قیاس۔

اجتہاد کی اس تعریف سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ مفہوم زیادہ عمومی ہے۔ اس سے کہ کسی ایسے حکم کو دریافت کرنے کے لیے پوری کوشش کی جائے، جس پر کہ پہلے علماء نے گفتگو کی ہو یا نہ کی ہو، اِس پر اُن کا اتفاق ہوا ہو یا اِس پر اُن کا اختلاف ہو۔ نیز اجتہاد کی مذکورہ بالا تعریف اس سے بھی زیادہ عمومی ہے کہ کسی حکم کی یہ دریافت دوسرے کی اعانت سے ہوئی ہو۔ مثال کے طور پر کسی نے مسائل کی صورتوں کی طرف توجہ دلادی یا احکام کے ماخذ کی طرف تفصیلی دلائل سے اشارہ کردیا یا حکم کی یہ دریافت بغیر کسی کی اعانت کے ہوئی ہو۔

اب یہ جو گمان ہے کہ وہ عالم مجتہد نہیں جو اکثر مسائل میں اپنے امام (شیخ) سے متفق ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی ہر حکم کی اُسے دلیل معلوم ہے اور اِس دلیل سے اُس کا دل مطمئن بھی ہے۔ نیز وہ اپنے اِس معاملے میں پوری بصیرت رکھتا ہے تو ایسا گمان، گمانِ فاسد ہے۔

اسی طرح جو شخص اوپر کے گمان کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ ان زمانوں میں مجتہد نہیں پایا جاتا تو اس کا ایسا سمجھنا غلط ہے۔

اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن اور سنت میں سے جن امور کا تعلق احکام سے ہے، اُن کی معرفت رکھتا ہو اور وہ اجماع کے مواقع، قیاس کے شرائط، نظر[1] کی کیفیت، عربی زبان، ناسخ و منسوخ اور راویوں کے حالات کو جانتا ہو اور یہ کہ اجتہاد کے لیے علم کلام اور فقہ کی ضرورت نہیں لیکن امام غزالی نے کہا ہے کہ ہمارے زمانے میں فقہ کی ممارست و مشق سے اجتہاد کی استعداد حاصل ہوتی ہے اور اس زمانے میں مسائل کو صحیح طرح سمجھنے کا یہی طریقہ ہے اور صحابہ کے زمانے میں اس کی ضرورت نہ تھی۔

بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ ہے جو علم کی ان پانچ قسموں پر حاوی ہو:-

اللہ عزوجل کی کتاب کا علم، رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم، علمائے سلف کے اقوال کا علم، اُن اقوال کا بھی جن پر اُن کا اجماع تھا اور اُن کا بھی جن میں اُن کا اختلاف تھا۔ لغتِ عربی کا علم اور قیاس کا علم۔ قیاس عبارت ہے کتاب و سنت سے استنباطِ حکم سے، جبکہ پیشِ نظر مسئلے کا حکم نہ تو صراحتاً کتاب و سنت میں ہو اور نہ اجماع میں......

جب کوئی عالم ان پانچوں اقسام میں سے اُن کا بڑا حصّہ جانتا ہوگا تو وہ اُس وقت مجتہد ہوگا۔ اس میں یہ شرط نہیں کہ وہ سب علموں کو پوری طرح جانتا ہو اور اُن کی کوئی چیز اُس سے چھوٹی نہ ہو۔ اگر وہ علوم کی اِن پانچ اقسام میں سے کسی ایک علم سے بہرہ نہیں رکھتا تو اِس کی راہ تقلید کی ہے (اجتہاد کی نہیں) خواہ وہ شخص ائمہ سلف میں سے کسی امام کے فقہی مذہب میں کتنا بھی کامل و تبحر کیوں نہ ہو۔ ایسے شخص کے لیے قاضی کا عہدہ قبول کرنا اور مسندِ افتا پر بیٹھنا جائز نہیں۔

مجتہدین کا اختلاف

کسی حکم میں مجتہدین کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ایسے فروعی مسائل میں جن میں حکم قطعی نہیں ہے، اگر دو مجتہدین میں اختلاف ہو تو دونوں حکموں کو صحیح ماننے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان دونوں میں سے ہر ایک مجتہد اس مسئلے کے حکم میں اپنی اپنی جگہ راہِ صواب پر ہے یا اِن میں سے ایک ہی راہِ صواب پر ہے؟ جو لوگ دونوں مجتہدوں کے راہِ صواب پر ہونے کے قائل ہیں، وہ یہ ہیں: شیخ ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر، قاضی ابویوسف، امام محمد بن الحسن، ابن شریح، نیز اشعری متکلمین کی ایک بڑی جماعت اور معتزلہ سے

[1] قیاس کے مقدمات کو ایسی ترتیب سے رکھنا کہ اُن سے صحیح نتیجہ حاصل ہو، یہ نظر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی ایسا ہی منقول ہے۔ قاضی ابو یوسف کی تصنیف کتاب الخراج میں اس بارے میں کچھ اشارے ہیں جو تقریباً صراحت پر دلالت کرتے ہیں۔

اختلافِ حکم کی صورت میں دو مجتہدین میں سے صرف ایک ہی راہِ صواب پر ہوگا۔ اس کے قائل جمہور فقہاء ہیں اور چاروں ائمہ سے بھی یہی منقول ہے۔

امام بیضاوی نے منہاج میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر مسئلے میں ایک حکم معین ہوتا ہے، جس کے حق میں کوئی قطعی یا ظنی دلیل ہوتی ہے۔ اب اگر دونوں اجتہادی حکم درست ٹھہریں تو یہ اجتماع نقیضین ہوگا۔ اس لیے کہ یہ دونوں حکم ایک دوسرے کے مخالف ہیں لیکن اس کے باوجود جو راہِ صواب سے چُوک جاتا ہے، وہ گنہگار نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو مجتہد راہِ صواب کو پالے گا، اُس کے لیے دو ثواب ہیں اور جو اس سے چُوک گیا، اُس کے لیے صرف ایک ہی ثواب ہے۔

امام بیضاوی لکھتے ہیں کہ راہِ صواب سے چُوک جانے پر بھی اجتہاد کرنے والے کے گنہگار نہ ہونے پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ جب ہر مسئلے کا ایک ہی حکم معین ہے تو اس حکم کا جو مخالف ہوگا، وہ قرآن کی اس آیت کا: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفسقون (جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے فرمان کے مطابق حکم نہیں دیتے، وہ فاسق ہیں) مصداق ہوگا۔ اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ اس مجتہد نے جو کہ راہِ صواب سے چُوک گیا، اسی بات کا حکم دیا تھا جسے اُس نے صحیح سمجھا تھا۔ اگرچہ اس کا یہ حکم اللہ کے نازل کردہ فرمان کے مطابق نہ تھا۔

یہ جو بیضاوی نے لکھا ہے کہ ہر مسئلے کے لیے ایک ہی معین حکم ہے تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اُن کا یہ قول بلا دلیل غیب پر حکم لگاتا ہے اور اُن کا امام شافعی کا یہ قول نقل کرنا کہ ''ہر واقعہ کے لیے ایک ہی معین حکم ہوتا ہے۔ اُس کی ایک علامت ہوتی ہے جو اُسے پالیتا ہے وہ صواب ہوتا ہے اور جو اُس سے چُوک جاتا ہے وہ غلطی پر ہوتا ہے اور گنہگار نہیں ہوتا۔'' ہم اُس کے جواب میں کہتے ہیں کہ امام شافعی کے اس قول کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر واقعہ کے بارے میں ایک قول ایسا ہوتا ہے جو اصول سے زیادہ موافق اور اجتہاد کے طریقوں میں مناسب تر ہوتا ہے۔ اُن میں دلائلِ اجتہاد میں سے واضح علامت ہوتی ہے۔ جو اُس علامت کو پالیتا ہے، وہ صواب پر ہوتا ہے اور جو اُسے نہ پاسکے، وہ غلطی پر ہوتا ہے لیکن وہ گنہگار نہیں ہوتا اور یہ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ امام شافعی نے اپنی کتاب 'الام' کے شروع میں اس کی صراحت کی ہے کہ جب ایک عالم دوسرے کو کہے کہ تم نے غلطی کی تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم اُس صحیح اور سیدھے راستے سے چُوک گئے جس پر کہ علماء کو چلنا چاہیے۔

بیضاوی نے اجتہاد میں غلطی کرنے والے کے گنہگار نہ ہونے کی جو دلیل دی ہے تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کے سلسلے میں ہمارے لیے یہ مقرر فرمایا ہے کہ ہم اس پر کاربند ہوں، جس تک ہمارا اجتہاد پہنچا دے۔ چنانچہ جس بات کو ہم پہلے اجمالاً جانتے ہوتے ہیں، پھر اس کی تفصیل کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں[1]۔ بیضاوی کا یہ کہنا کہ مجتہدوں کے باہم دِگر دو مختلف اجتہادوں کا صواب پر ہونا اجتماع نقیضین ہے۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ اجتماع نقیضین نہیں، بلکہ اس کی صورت کفارہ کی ادائیگی کے متعدد طریقوں سے ہے کہ اُن میں سے ہر ایک طریقہ واجب بھی ہے اور واجب نہیں بھی[2]۔ بیضاوی نے اس مضمون کی یہ جو

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اجتہاد امرِ تعبدی ہے اور امرِ تعبدی میں اگر غلطی ہوجائے تو گناہ نہیں۔ مثلاً اگر کسی وجہ سے نماز کے لیے قبلے کی سمت کا تعین نہیں ہو پاتا تو اس صورت میں اندازے سے جس سمت کا تعین کرکے نماز پڑھ لی جائے، خواہ وہ بعد میں صحیح نہ بھی ہو، وہ نماز صحیح ہوگی۔

[2] کسی گناہ یا غلطی کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا بھی ہوتا ہے، روزے رکھنا بھی اور مسکینوں کو کھانا کھلانا بھی۔ ان میں سے ہر ایک واجب ہے۔ جسے ایک کا مقدور نہ ہو وہ دوسرے عمل سے کفارہ ادا کرسکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدیث نقل کی ہے کہ اگر مجتہد کا اجتہاد صواب پر ہو تو اُس کو دو ثواب ملیں گے اور اگر وہ غلطی پر ہوگا تو اُس کو ایک ثواب ملے گا، اِس بارے میں میں کہتا ہوں کہ یہ نقلی دلیل تو اُن کے خلاف جاتی ہے نہ کہ اُن کے حق میں کیونکہ ایسی غلطی جو موجبِ ثواب ہو، وہ معصیت و گناہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ امر لازمی ہے کہ دونوں اجتہادی حکم اللہ تعالیٰ کے لیے ہوں اور ان میں ایک دوسرے سے افضل ہو جیسے کہ عزیمت اور رُخصت کا معاملہ ہے یا دو حکموں میں سے ایک کا صواب پر اور دوسرے کا اُس کے مخالف ہونا عدالت کے فیصلے کی رُو سے ہے کیونکہ دعویٰ کرنے والے مدعی اور دعوے کا انکار کرنے والے میں سے کسی ایک ہی کا قول خارج میں تحقیق پذیر ہوگا۔

بیضاوی نے یہ جو کہا ہے کہ ہر مجتہد نے وہی حکم دیا جو اُس کے گمان میں صواب تھا تو ہم کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی مقصود کا اعتراف ہے۔ اُن کا یہ کہنا کہ مُخطی (خطا اور غلطی کرنے والا) مُبطل (باطل کا مرتکب) نہیں ہوتا تو ہم کہتے ہیں اس لیے وہ حق کا مخالف نہ ہوا کیونکہ مخالفِ حق لازمی طور پر باطل ہوگا اور حق کے بعد سوا گمراہی کے اور کیا ہے؟

(امام بیضاوی کے اقوال کا محاکمہ کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب اس مسئلے میں اپنے رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ) حق یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کی طرف یہ جو قول منسوب ہے کہ مجتہدین کے اجتہاد میں اگر اختلاف ہو تو اُن میں سے صرف ایک ہی مجتہد صواب پر ہوگا، وہ اُن کی تصریحات سے استنباط کیا ہوا ہے۔ اُن کا بطور ایک نص کے یہ قول نہیں ہے اور یہ کہ ساری اُمّت میں دونوں مجتہدوں کو (اختلافِ اجتہاد کے باوجود) برسرِ صواب قرار دینے میں کوئی اختلاف نہیں بشرطیکہ مسئلہ ایسا ہو جس میں نص اور اجماع کی رُو سے ایک سے زیادہ باتوں کا اختیار دیا گیا ہو، جیسا کہ قرآن کو سات قرأتوں میں پڑھنا، دعاؤں کو مختلف الفاظ میں مانگنا، سات، نو یا گیارہ وتر پڑھنا۔

اسی طرح یہ بھی نہیں چاہیے کہ نصوص سے دلالتًا جو احکام مستنبط کیے جاتے ہیں اور اُن میں اختیار دیا جاتا ہے، اِس معاملے میں علماء اختلاف کریں۔

سچ یہ ہے کہ اختلاف کی چار قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اُس میں حق قطعی اور معین ہو۔ اِس صورت میں جو چیز اِس کے خلاف ہوگی، اُسے لازمًا مسترد کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ یقینی طور پر باطل ہوگی۔ اختلاف کی دوسری قسم یہ ہے کہ اُس میں غالب رائے سے حق کا تعیّن ہوا ہو۔ چنانچہ اِس میں مخالف چیز غالب رائے سے باطل قرار پائے گی۔ تیسری یہ کہ اختلاف کے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا قطعی حکم ہو اور چوتھی قسم یہ ہے کہ غالب رائے سے اختلاف کے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حکم ہو۔

اب اگر کسی ایسی بات میں اختلافِ اجتہاد ہو جس کے متعدد احکام میں سے کسی ایک حکم کو لینے کا اختیار دیا گیا ہو جیسا کہ قرآن کی سات قرأتیں، دعاؤں کے مختلف کلمات اور ایسے ہی وہ اُمور جنہیں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی سہولت کے لیے کئی طرح انجام دیا اور یہ سب کے سب اُن اُمور کی جو اصل مصلحت تھی، اُس پر حاوی تھے تو اس معاملے میں دونوں اختلاف رکھنے والے مجتہد برسرِ صواب ہوں گے۔ یہ امر پوری طرح واضح ہے اور اِس میں کسی کو تامل نہیں ہونا چاہیے۔

بہت سے اصولِ فقہ کا اختلاف نتیجہ ہوتا ہے کسی امر کے قرائن کو دیکھ کر سعی و کوشش سے اُس کے بارے میں کوئی حکم لگانے اور اُس پر دلی اطمینان ہو جانے کا، نبی ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں فرمایا ہے۔ بعض امور ایسے ہیں کہ اُن میں جس حکم کی طرف آدمی کی کوشش و جستجو اُسے لے جائے، اِسی کا اُس کو مکلف بنایا جاتا ہے۔

اِن اُمور میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس دن (رمضان کے روزوں کے بعد عید کے دن) تم افطار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہو، وہی تمہارا انطار کا دن ہے اور جس دن (عید الاضحٰی کے دن) تم قربانیاں کرتے ہو، وہی تمہارا قربانیوں کا دن ہے۔ الخاطبی کہتے ہیں: اِس حدیث کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسے اُمور جن میں اُن کے حکم تک پہنچنا اجتہاد پر منحصر ہو، اُن میں غلطی اور خطا معاف ہوتی ہے۔ مثلاً لوگوں نے عید کا چاند دیکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن اُن کو تیس روزے پورے کرنے کے بعد ہی چاند نظر آیا۔ بعد میں اُن کو معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ انتیس دن کا تھا۔ اس صورت میں اُن کا (زائد ایک دن کا) روزہ رکھنا اور (دوسرے دن) افطار کرنا درست تھا اور اُن پر کوئی گناہ کا بار یا عتاب نہ ہوگا۔ اسی طرح حج کے موقع پر اگر لوگوں سے عرفہ کے دن کے بارے میں غلطی ہوجائے تو انہیں دوبارہ حج کرنا نہیں پڑے گا اور جو مناسکِ حج وہ ادا کرچکے ہوں گے، وہ کافی ہوں گے۔

یہ جو رعایت ہے تو یہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے ایک سہولت اور اپنے بندوں کے لیے نرمی ہے اور انہی اُمور میں سے آپؐ کا یہ ارشاد ہے کہ حاکم جب اجتہاد کرے اور راہِ صواب کو پالے تو اُس کے لیے دو ثواب ہیں۔ جب وہ اجتہاد کرے اور اُس سے غلطی ہو تو اُس کے لیے ایک ثواب ہے۔

فقہ کے مذاہب اربعہ کو اختیار کرنے کی تاکید

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فقہ کے ان چار مذاہب کو اختیار کرنے میں ایک بہت بڑی مصلحت ہے اور ان تمام کے تمام سے اعراض و رُوگردانی میں بہت بڑا فساد ہے۔ ہم اِس بات کی یہاں کئی وجوہ سے وضاحت کرتے ہیں...... اوّل یہ کہ تمام اُمت کا اِس پر اجماع ہے کہ وہ شریعت کو جاننے کے لیے سلف پر اعتماد کرتی ہے۔ چنانچہ تابعین نے اِس بارے میں صحابہ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر۔ اِسی طرح ہر طبقے میں علماء نے اپنے پہلے علماء پر اعتماد کیا اور خود عقل اس طریقہ کار کے حُسن و خوبی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ شریعت کی معرفت صرف نقل اور استنباط ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اب نقل کے صحیح اور درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ استنباط کرنے والا پہلوں کے مذاہب کو جانے تاکہ وہ اُن کے اقوال کے دائرہ سے باہر نہ نکلے ورنہ اجماع کے خلاف جائے گا۔ اس لیے اُسے چاہیئے کہ وہ پہلوں کے مذاہب پر اپنے اقوال کی بنا رکھے اور اُس سے پہلے جو گزر گئے ہیں، اُن سے استنباط میں مدد لے۔

جب شریعت کی معرفت کے لیے نقل کے سلسلے میں سلف کے اقوال پر اعتماد کرنا طے ہوگیا تو یہ ضروری ہوا کہ سلف کے وہ اقوال جن پر کہ اعتماد کیا جائے یا سندِ صحیح سے مروی ہوں یا وہ مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں اور یہ بھی ضروری ہوا کہ اُن اقوال پر اِس طرح بحث ہوچکی ہو کہ اُن میں جو کئی ایک احتمالات ہوں، اُن میں سے راجح احتمال کا تعین ہو۔ اُن کے بعض مقامات میں جو عمومی چیزیں ہوں، اُن کی تخصیص ہوچکی ہو۔ بعض مقامات میں جو مطلق ہوں، اُن کو مقید کردیا گیا ہو۔ جو اقوال باہم مختلف ہوں، اُن میں تطبیق دے دی گئی ہو اور وہ اقوال جن احکام پر متضمن ہیں، اُن کی علتیں بیان ہوچکی ہوں۔ اگر سلف سے مروی اقوال ان مراحل سے نہیں گزرے تو اِن پر اعتبار کرنا درست نہیں ہوگا۔

بعد کے زمانوں میں فقہ کے مذاہب اربعہ کے علاوہ اور کوئی ایسا مذہب نہیں جو اِن صفات کا حامل ہو۔ ماسوا مذہب امامیہ اور زیدیہ کے اور وہ اہلِ بدعت ہیں جن کے اقوال پر اعتماد کرنا جائز نہیں۔

مذاہب اربعہ میں سے کسی نہ کسی مذہب کو اختیار کرنے پر زور دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سوادِ اعظم (بڑے گروہ) کی پیروی کرو اور چونکہ ان چار مذاہب فقہ کے علاوہ باقی فقہ کے تمام مذاہب حقہ مٹ گئے ہیں تو اِن چاروں کی پیروی کرنی سوادِ اعظم کی پیروی کرنا ہے اور اُن کے دائرے سے نکلنا سوادِ اعظم سے نکلنا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تیسری وجہ یہ ہے کہ جب لمبا زمانہ گزر گیا، عرصۂ دراز ہوگیا اور امانت و دیانت نہ رہی تو ان حالات میں بجور پیشہ قاضیوں اور اپنی خواہشات کے بندے مفتیوں میں سے جو علماء سُوء تھے، اُن کے اقوال پر اعتماد کرنا جائز نہ رہا...... چنانچہ جب ہم نے علماء کو دیکھا کہ وہ مذاہبِ سلف پر ثابت قدم ہیں تو ظن غالب یہ ہوا کہ وہ علمائے سلف کے اقوال سے جو تخریجات یا کتاب و سنت سے جو استنباط کریں گے، اُن میں اُن کی تصدیق کی جائے گی اور جب ہم نے اُن میں یہ بات نہ دیکھی تو پھر اُن کے اقوال پر اعتماد کہاں؟

تقلید میں مسلکِ اعتدال

تقلید میں افراط و تفریط کے درمیان جو بیچ کی راہ ہے، مذاہبِ اربعہ کے اختیار کرنے والوں میں جو جمہور علماء تھے، وہ اسی راہ پر چلے اور ائمہ مذاہب نے اپنے اصحاب کو اسی کی تلقین کی۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے اپنی کتاب الیواقیت والجواہر میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جو شخص میری دلیل نہیں جانتا، اُسے میرے کلام کی بنیاد پر فتویٰ نہیں دینا چاہیے اور جب وہ فتویٰ دیتے تو لکھتے کہ یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے اور جتنی بھی ہم میں مقدرت تھی، اُس لحاظ سے یہ بہترین رائے ہے۔ جو شخص اِس سے بہتر رائے پیش کرے وہ صواب کا مستحق ہوگا۔ امام مالکؒ کہا کرتے تھے کہ کوئی ایسا نہیں جو اپنی بات پر قابلِ مواخذہ نہ ہو اور اُس کی بات اُسی کی طرف نہ لوٹائی جائے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

الحاکم اور بیہقی نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جب کوئی حدیث ثابت ہوجائے تو وہی میرا مذہب ہے اور ایک اور روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ اگر تم میری بات کو حدیث کے مخالف پاؤ تو حدیث پر عمل کرو اور میری بات دیوار پر مار دو...... امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے ارشاد پر کسی کو کلام کرنے کا حق نہیں۔ نیز اُنھوں نے ایک شخص سے کہا کہ نہ تم میری تقلید کرو نہ مالک کی، نہ اوزاعی کی نہ نخعی کی اور نہ ان کے علاوہ دوسروں کی، تم وہیں سے احکام اخذ کیا کرو جہاں سے ان لوگوں نے اخذ کیے تھے یعنی کتاب و سنت سے۔

عبدالوہاب شعرانی نے مذہبِ فقہ کے علماء کی ایک بہت بڑی جماعت سے نقل کیا ہے کہ اِن مذاہب کے ائمہ کے وقت تک سے لے کر اُن (عبدالوہاب شعرانی) کے زمانے تک علماء کا دستور یہ تھا کہ وہ کسی ایک معیّن فقہی مذہب کے التزام کے بغیر جملہ مذاہب کے مطابق عمل کرتے اور فتویٰ دیتے تھے۔

عبدالوہاب شعرانی نے اس کا ذکر اسی طرح کیا ہے کہ اُن کی بات اِس امر کی مقتضی معلوم ہوتی ہے کہ پُرانے اور نئے زمانے میں علماء کا برابر یہی عمل رہا۔ یہاں تک کہ یہ چیز متفق علیہ اور اس کی حیثیت مسلمانوں کے ایسی شاہراہ کی ہوگئی جس کے خلاف جانا صحیح نہ تھا۔

میرے استاد شیخ ابوطاہر نے جو شافعی المذہب تھے، اپنے استاد شیخ حسن العجمی کی نسبت جو حنفی تھے، مجھ سے یہ واقعہ نقل کیا کہ وہ ہمیں نجاست قلیل کے معاملے میں اپنی عورتوں پر سختی نہ کرنے کا حکم دیا کرتے تھے کیونکہ اِس میں اُن کے لیے بڑی زحمت ہے۔ وہ ہمیں کہتے کہ اس بارے میں ہم امام ابوحنیفہ کا مذہب اختیار کریں کہ اگر نجاست درہم سے کم ہو تو وہ معاف ہے۔ (شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں) ہمارے اُستاد شیخ ابوطاہر کو (شافعی المذہب ہونے کے باوجود) اپنے استاد (جو حنفی تھے) کا یہ قول پسند تھا۔

(شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی یہ کتاب "عِقدُ الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید" ان الفاظ پر ختم کی ہے:)

...... ارشادِ خداوندی ہے: "فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔" (پس پوچھ لو اہل الذکر سے اگر تم نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جانتے) اور سوال تب ہی ہوسکتا ہے کہ کسی معیّن واقعہ کے بارے میں حکم معلوم کرنے کی ضرورت ہو۔ اِس صورت میں اگر سوال پوچھنے والے کو مجتہد کا قول مثبت طور پر مل جاتا ہے تو اس پر عمل کرنا اِس کے لیے واجب ہوگا۔ فقہاء نے ایک ہی فقہی مذہب کا التزام کرنے کی جو تاکیدیں کی ہیں تو غالبًا وہ اس لیے تھیں کہ لوگ (مختلف فقہی مذاہب کی) رخصتوں کے پیچھے نہ پڑ جائیں، ورنہ عامی کے لیے یہ زیادہ سہل ہے کہ وہ ہر مسئلے میں کسی مجتہد کے قول پر عمل کرے۔

اور مجھے معلوم نہیں کہ کونسی نقلی اور عقلی دلیل اِس میں مانع ہے کہ انسان کسی مجتہد کے، جس کے لیے کہ اجتہاد جائز ہو، اُس قول کو معلوم کرنے کی کوشش کرے، جو اُس کے لیے زیادہ سہل ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ شریعت نے ایسا کرنے کی مذمت کی ہو حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ آپؐ ان باتوں کو محبوب رکھتے تھے جو آپؐ کی اُمت پر سہل ہوں۔ باقی اللہ سبحانہٗ امرِ ثواب کو بہتر جانتا ہے۔

ہم اس رسالے میں کتاب ''فتح القدیر'' سے جو نقل کرنا چاہتے تھے، وہ یہاں ختم ہوتا ہے۔ والحمد للہ اولاً واٰخرًا۔

ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی سے ملنے کے اوقات

اہلِ علم اور اہلِ قلم کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ سندھ کے مشہور عالِم دین، جدید و قدیم کے مرقع، تحریر و تقریر میں یگانۂ روزگار، سلف صالحین کی روایات کے امین حضرت مولانا سلیمان طاہر صاحب نے سالِ رواں سے اپنی خدمات شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد کے حوالہ کی ہیں۔

ملاقات کے اوقات یہ ہیں:

صبح 10 بجے سے دوپہر تک

سید رسول بخش شاہ
شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدرآباد

الولی اور الرحیم کے لئے مضامین ارسال فرمائیں

اہلِ علم اور اہلِ قلم سے درخواست

شاہ ولی اللہ اکیڈمی محکمہ اوقاف سندھ کا ایک علمی ادارہ ہے، جو طویل عرصے سے اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ دینی لٹریچر کے علاوہ اس ادارے کے تحت ماہنامہ ''الولی'' (اردو) اور ماہنامہ ''الرحیم'' (سندھی) شائع ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ تعطّل کے بعد آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ مذکورہ بالا دونوں رسالے اب باقاعدہ شائع ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں قارئین کرام بالخصوص علماء کرام اور اہلِ قلم حضرات کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ اس ادارے کے لئے اپنی علمی اور فکری رشحاتِ قلم درجِ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔ ہم شکریہ کے ساتھ ان کالموں میں ان کو جگہ دیں گے۔ بالخصوص اُن مضامین کو بنظرِ استحسان دیکھا جائے گا جو فکرِ ولی اللّٰہی کی ترویج و اشاعت میں ممد و معاون ہوں۔ دینی، مذہبی، علمی موضوعات کے علاوہ بزرگانِ دین اور علماء اسلام کی شخصیات اور ان کے علمی کارناموں پر مشتمل اپنی تحقیقی کاوشیں اور ان کی کتابوں کے تراجم بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔ نیز قارئین کرام سے یہ بھی گزارش ہے کہ ہمیں ہماری کوتاہیوں سے آگاہ کرتے رہیں اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہا کریں، تاکہ یہ ادارہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوسکے۔

سلیمان طاہر
ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی

© rasailojaraid.com